ہماری مطبوعات

گھاٹ کا پتھر	گلشن نندہ	۵-۰۰
جلتی چٹان	〃	۴-۵۰
ستاروں سے آگے	〃	۴-۰۰
راکھ اور انگارے	〃	۴-۰۰
گیلارڈ	〃	۶-۰۰
سوکھے پیڑ سبز پتے	〃	۵-۲۵
[illegible]	[illegible]	۴-۰۰
تیاگ	سرت چندر	۴-۰۰
آوارہ	〃	۵-۰۰
منجھلا دد	〃	۵-۵۰
ٹھنڈی آگ	〃	۴-۲۵
البیلی	〃	۴-۰۰
بے بسی	ٹیگور	۴-۵۰
تھپیڑے	〃	۴-۵۰
پتھریلے راستے	〃	۴-۲۵
دنیا سے دور	〃	۴-۷۵
دوشیزہ کا بن	صادق حسین	۱۲-۰۰
خالی ہاتھ	عمر عادل مارہروی	۴-۰۰
کاغذ کی ناؤ	کرشن چندر	۴-۲۵
زرگاؤں کی رانی	کرشن چندر	۳-۵۰
کونپل	ایل بیچ آبادی	۵-۰۰
زندگی مسکرائی	زلیخا حسین	۵-۲۵
آدمی اور سکے	〃	۴-۲۵
تاریکیوں کے بعد	〃	۴-۷۵
اپنے اور پرائے	〃	۵-۲۵
ایک خواب ایک حقیقت	〃	۴-۲۵
ارمانوں کا خون	سرور جہاں	۵-۰۰
ضدی لڑکی	درگا شنکر بھاردواج	۵-۵۰
ایک آنسو ایک پتھر	کرپا شنکر بھاردواج	۵-۵۰
زوربا	مخمور جالندھری	۱۰-۰۰
بھنورے	ضیا عظیم آبادی	۴-۵۰
پنگھٹ	〃	۴-۵۰
انجانی راہیں	〃	۵-۰۰
انگڑائی	〃	۵-۵۰
گرداب	〃	۵-۰۰
کورا آنچل	〃	۵-۵۰
ایک ننھی آشا	〃	۴-۰۰
اڑان	عارف مارہروی	۵-۵۰

روح کے زخم	عارف مارہروی	۵-۰۰	مہکتے زخم	جمیل انجم	۵-۵۰
گمراہ	،،	۵-۵۰	بینا چہرہ	راقم صدیقی	۵-۵۰
ریشم کے تار	،،	۴-۷۵	گرداب ہلاکت	کرشن بی اے	۴-۵۰
بندھن	،،	۵-۵۰	دھڑکنیں	ایم احمد جاوید	۵-۵۰
موت کے بعد	اظہار اثر	۳-۵۰	شکیلہ	مسعود ہمایوں	۴-۲۵
پتنگا	گورونت	۴-۰۰	سناٹا	،،	۴-۵۰
آرسین لوپن جاسوس	تیرتھ رام فیروزپوری	۵	خوفناک پرچھائیاں	،،	۴-۰۰
سنہری ناگن	،،	۴-۵۰	چمگادڑ	،،	۳-۰۰
بولان جیل کا قیدی	بدنام قرنی	۴-۰۰	[illegible] احمد علی	،،	۴-۵۰
سونی وادیاں	کرشن گوپال عابد	۳-۷۵	[illegible]		
تیری یاد آئی	انیس مرزا	۵-۵۰	بہتا پانی دور کنارہ	شرن	۴-۰۰
قرار کو ترسے	،،	۵-۵۰	کٹی پتنگ	شرن	۳-۵۰
			شازیہ	تنویر زہر نجاری	۷-۰۰

ان کے علاوہ دیگر کتب کے لئے براہ راست ہمیں لکھیں۔ لائبریریوں کے لئے خاص کمیشن دیا جاتا ہے۔ بذریعہ خط و کتابت معلومات حاصل کریں۔

اہلووالیہ بکڈپو ۴/۳۷ نیو روہتک روڈ

نزد لبرٹی سینما قرول باغ نئی دہلی ۵

زرگاؤں کی رانی

کرشن چندر

قیمت

تین روپے پچاس پیسے

(اسمو ولیتھو پریس دہلی)

اہلو والیہ بکڈپو ۳۲/۴ روہتک روڈ نئی

زرگاؤں کی رانی

کرشن چندر

ZARGAON Ki RANI

Rs. 3-50 NP.

Krishan Chander.

دوپہر کا کھانا کھا کے میں آرام کرنے کی نیّت سے بستر پہ لیٹا ہی تھا کہ میرا اردلی چارلی دروازے ہی سے یہ کہتا ہوا اندر آیا۔ جلدی چلیئے حضور ـــ گڑھی سے آدمی آیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ رانی صاحبہ سخت بیمار ہیں۔ !"

آرام میں خلل پڑنے سے میں منہ ہی منہ میں بڈبڈاتا ہوا اٹھا۔ کیونکہ مجھے دوپہر میں قیلولہ کرنے کی عادت ہے۔ اور جب اس میں کھنڈت پڑ جائے۔ تو مجھے سخت اکھرتا ہے۔! مگر گڑھی کا حکم تو شاہی حکم ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد اور ریاستوں کے خاتمے کے بعد۔ آج بھی زرگاؤں کے علاقے میں رانی صاحبہ کی ایک طرح سے پوجا ہوتی ہے۔ ! گڑھی کی مالکن کا حکم کوئی نہیں ٹالتا۔ حالانکہ مجھے اس علاقے میں

تعینات ہوئے صرف پانچ روز ہوئے تھے۔ لیکن اتنا میں نے اس عرصہ میں ضرور معلوم کر لیا تھا۔:

جتنے عرصہ میں، میں نے کپڑے بدلے اور اپنا بیگ سنبھالا۔ اتنے عرصہ میں چارلی میرا گھوڑا تیار کر چکا تھا۔ میں نے بیگ گڑھی سے آئے ہوئے آدمی کو دیا اور خود گھوڑا دوڑاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

زرگاؤں کا علاقہ پہاڑی ہے۔ لوگ اکھڑ۔ خوب صورت اور بدمزاج ہیں۔ اس علاقے میں ابھی تک کوئی موٹر روڈ نہیں ہے۔ گہری کھائیوں کھڈوں اور وادیوں والی زمین ایسی سنگلاخ ہے کہ اسے آسانی سے فصل پیدا کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا —— لوگ زیادہ تر فوج میں بھرتی ہوتے ہیں۔ اور خاندانی دشمنی نسل بہ نسل یاد رکھتے ہیں۔!

میں گھوڑے کو جھمیز دیئے آگے بڑھتا جا رہا تھا ایک اونچے پہاڑی ٹیلے پر گڑھی کی سرخ فصیلیں، کبھی اخروٹ کے درختوں میں چھپتی ہوئی۔ کبھی دھوپ میں چمکتی ہوئی۔ قریب آتی جاتی تھیں۔ مجھے اپنے بنگلے سے گڑھی کے پھاٹک تک پہنچنے میں کوئی ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا —— پھاٹک پر دو چوبدار بڑی بے تابی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں آتے دیکھ کر ہی گڑھی کے بڑے بڑے پھاٹک .... آہنی

کنڈوں والے ...... اور شیر اور مور کی چوبی تصویروں والے کھول دیئے اور ہم اترے بغیر اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے اندر چلے گئے۔

ایک محراب دار نیم تاریک ڈیوڑھی سے گزر کر گڑھی کے وسیع صحن میں پہنچ گئے۔ جہاں دھوپ تھی۔ اور آسمان کھلا نظر آتا تھا۔ اور پھلدار پیڑوں کی قطاریں۔ تربیت یافتہ سنتریوں کی طرح کھڑی تھیں۔ اور روشوں کے اردگرد چوکور قطعوں میں گھاس ایسی گہری سبز اور دبیز پرانی اور خاندانی تھی۔ جیسے زرگاؤں کی گڑھی کا خاندان تھا ــــــ جو اس گڑھی میں اور آس پاس کے علاقے میں گزشتہ بارہ سو سال سے حکومت کرتا چلا آیا تھا۔ ایسی گھاس شہروں کے لان میں نہیں اگتی۔ محض سائنس اور کھاد کی مدد سے نہیں اگائی جا سکتی۔ ایسی گھاس کے لئے بارہ سو سال کا تسلسل بھی ضروری ہے۔

ایک ملازم نے دوڑ کر میری رکاب پکڑ لی۔ میں گھوڑے سے اتر آیا۔ اور صحن کی روشوں پر چلتا چلتا سرخ پتھروں کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کے باغ میں پہنچا ــــــ جہاں شاہ بلوط کے گھنے پیڑ تھے اور اخروٹ کے چھدرے پیڑ تھے اور نشنگ کے گھیرے دار بڑے بڑے تنوں والے پیڑ تھے۔ جن پر انگور کی بیلیں پٹی ہوئی تھیں۔ اور ان کے پیچ

منظر میں ہمالیہ کی اونچی چوٹیاں برف کے فرغل پہنے نظر آرہی تھیں۔ ان مغرور حسیناؤں کی طرح جو سج سنور کر کسی پارٹی میں جانے کے لئے تیار ہوں۔ مگر آپ کی طرف دیکھنے سے احتراز کر رہی ہوں۔ منظر اتنا خوبصورت تھا۔ کہ میں چلتے چلتے رک گیا۔ چند لمحوں کے بعد میرے ساتھ آنے والے ملازم نے مجھے ایک مشفقانہ ٹھوکا دیا اور میں چونک کر اس کے ساتھ ساتھ آگے چلنے لگا۔

پرانے چھتے ہوئے منقش محرابوں والے ایک دالان سے گزر کر ہم ایک زنانہ ڈیوڑھی میں پہنچے۔ یہاں ایک مؤدب خادمہ نے خاموشی سے ہمارا استقبال کیا۔ میرے ساتھ آنے والے دونوں ملازم ڈیوڑھی کے باہر رہ گئے تھے۔ اور اب میرا بیگ خادمہ نے سنبھال لیا تھا۔ وہ تیز اور بے آواز قدموں سے ایک لمبی غلام گردش میں چلتی ہوئی مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے بڑھ گئی۔ غلام گردش کا غالیچہ بہت ہی پرانا اور قیمتی معلوم ہوتا تھا۔ دو رویہ کاٹھ کی نازک راجپوتی محرابوں پر زربفت کے پردے جھول رہے تھے۔ اور ان پر کہیں کہیں کاسنی سیاہ رنگ مرمر۔ پیپل اور اخروٹ کی لکڑی کے پرانے اور پراسرار بت ایستادہ تھے۔ چھت زیادہ اونچی نہ تھی۔ اور اس سے پرانی وضع کے پرانی پرتگیزی لالٹینوں والے

فانوس لٹک رہے تھے۔ پوری فضا میں اگرتی دھوپ اور لوبان کی مہک چھائی ہوئی تھی۔ جونہ جانے کیوں اپنی خوشبو کے باوجود میرے ذہن میں ایک بیزار کن کیفیت پیدا کرنے لگی۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا۔ اندر ہی اندر اپنے ماحول سے الجھتا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایسا کیوں ہے۔؟ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ میرے شہری اور سائینسی تربیت یافتہ ذہن پر یہ ماحول گراں بار گزر رہا تھا۔

خادمہ پوری نظام گردش گھوم کر بائیں طرف ایک بند دروازے کے سامنے لے گئی۔ جس پر ببر شیر اور مور کی چوبی تصویریں ابھری تھیں۔ ! تصویریں سنہوری تھیں اور ان کے گرد کی زمین کا پینیٹ سرخ رنگ کا تھا۔ اور بند دروازے دونوں طرف اعلیٰ قسم کے چینی جنید کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ خادمہ نے بند دروازے تک پہنچکر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اور جب میں نے اسے اپنے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ تو وہ جلدی سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اور خاموشی سے نگاہیں جھکا کر اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے اکیلے ہی اندر جانے کا اشارہ کیا۔!

میں جنید کی جھالروں کی لڑیاں سرکا کر دروازے کو کھول کر داخل ہو گیا۔

وہ چاندی کے پایوں والے ایک اونچے چھپر کھٹ نما بستر پہ نیم دراز تھی۔ تکیوں نے اس کے سر کو اٹھا رکھا تھا۔ اس کا چہرہ گول اور بوڑھا تھا۔ وہ سبزی مائل آنکھیں بڑی تجسس سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ کیونکہ گڑھی کے اندر آنے کا۔ اور گڑھی کی مالکن سے ملنے کا میرا یہ پہلا موقعہ تھا۔

اس لیے میں اسے اور وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک تھی۔ اور گال بخار کی حدت سے یا کسی اندرونی کھولن سے تمتمائے ہوئے تھے۔ اور سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ وہ شدید علیل دکھائی دیتی تھی۔ مگر اس علالت میں بھی اپنے آپکو سنبھالے ہوئے تھی۔

"ڈاکٹر گھوش ؟" مریضہ نے تحکمانہ لہجہ میں مجھ سے پوچھا۔ اور جب میں نے ذرا سا جھک کر اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ تو اس نے مسکرا کر مجھے بستر کے قریب رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

"کہاں تھے تم ؟ میں گزشتہ چار روز سے تمہارے لئے اپنا آدمی بھیج رہی ہوں۔ !"

اس کی آواز میں ایسا طنطنہ تھا۔ جیسے میں اس کا زر خرید غلام ہوں۔ یہ لوگ آزادی کے بعد بھی اپنی عادتیں نہیں سدھار سکے۔ بارہ سو سال کی پرانی عادت ہے۔

کیسے بدلے گی۔ کچھ ہوکے ختم ہو جائیگی یا ختم کردی جائے گی۔
مگر اس کا بدلنا مشکل ہے۔

مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر ہی اندر غصہ بڑھ رہا
ہے۔ مگر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے میں نے بے حد مودب لہجہ
میں کہا۔ " رانی صاحبہ۔ میں دورے پر تھا۔ پہاڑی
علاقہ کے ڈاکٹر کو آتے ہی سب سے پہلے اپنے علاقے کی حدود
اور اس کے مریضانہ فائیل کا مطالعہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے!"

" تم کو سب سے پہلے میرے پاس آنا چاہیے تھا۔
آج تک ایسا ہی ہوتا آیا ہے....... میں زرگاؤں کی رانی
ہوں۔ ریاست نہیں رہی تو کیا شرافت بھی ختم ہو گئی..!"
اس کے لہجہ میں ایک تیز اور تند شکایت تھی جس کی نوک بڑی
بے رحم تھی۔ مگر میں نے اسے بھی نظر انداز کر دیا۔ اور ہمدردی
بھرے لہجہ میں کہا۔

" مجھے بہت افسوس ہے۔ واقعی شدید افسوس
ہے....... بتایئے آپ کو تکلیف کیا ہے۔؟"

" میں مر رہی ہوں۔؟"

" یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔؟" میں نے حیرت
ظاہر کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ " آپ اس درجہ علیل تو نہیں
دکھائی دیتیں۔!"

"ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے تمہارا معائنہ بھی ظاہر کرے کہ مجھے کوئی خطرناک بیماری نہیں ہے۔ مگر میں جانتی ہوں کہ میں مر رہی ہوں۔ اور دنیا کا کوئی قابل سے قابل ڈاکٹر بھی مجھے نہیں بچا سکتا۔ !"

اس کی آواز میں شدید قطعیت تھی۔ میری حیرانی بڑھتی گئی۔ وہ میری سوالیہ خاموشی سمجھ کر بولی۔

"تم اپنے دل میں جو سوچتے ہو ٹھیک ہی سوچتے ہو کہ جب میں واقعی مر رہی ہوں۔ تو تمہیں بلانے کی کیا ضرورت مجھے پیش آئی۔ تمہارا سوال اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ مگر میں نے تمہیں علاج کے لئے نہیں بلایا ہے۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ وہ باتیں جو میں کسی اجنبی ہی سے کہہ سکتی ہوں۔ اور تم میرے لئے مکمل اجنبی ہو۔ کرسی میرے نزدیک کھسکا لو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ !"

"آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ ؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ دیکھئے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو بیماری کیا ہے۔ آپ کیوں مرنے کی باتیں کر رہی ہیں۔ ؟"

"تم اپنا اطمینان کر سکتے ہو۔" رانی نے مجھے معائنہ کرنے کی اجازت دیدی۔ !

مرلیضہ کی نبض بہت تیز تھی۔ اسے ایک سو پانچ

ڈگری کا بخار تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں میں ایک وحشت ناک چمک تھی۔ اور خون کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھا ہوا تھا۔ مجھے تو اس کی دماغی حالت بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ سب ملا کے حالت واقعی خطرناک تھی۔ میں نے مریضہ کے احتجاج کے باوجود اسے فوراً انجکشن دیا۔ اور دوا پلائی۔ اور دوسری طبّی تدابیر اختیار کرنے پر زور دیا۔ وہ ہوں ہاں کرتی رہی۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا۔ جیسے وہ میری حماقتوں سے سخت عاجز ہے۔ اور محض مجھے بہلانے کے لئے میری ہاں میں ہاں ملا رہی ہے۔

یکایک اس نے مجھے آستین سے کھینچ کر کرسی پر بٹھا دیا۔ اور ایک تیز وحشیانہ سرگوشی میں بولی۔ بیٹھ جاؤ۔ اور سن لو۔ جلدی سن لو۔ وہ جسے سنانے کے لئے میری جان میرے حلق میں اٹکی ہوئی ہے۔ !"

میں نے مجبور ہو کر اپنے ہاتھوں کی ہنسلیاں اپنی گود میں رکھ لیں اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

وہ میرے منع کرنے کے باوجود اٹھ کر اور تکیوں کا سہارا لے کر بستر پر بیٹھ گئی۔ یکایک اس کی نگاہ میرے سر پر سے گزر گئی۔ اور دور پیچھے جا کر کہیں رک گئی۔ پھر اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی آئی۔ اور اس کی آنکھوں کی وحشت

ناگی بڑھ گئی۔!

میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔

میرے پیچھے دائیں طرف کوئی تین گز کے فاصلے پر اس خواب گاہ میں سے ایک دروازہ ایک ڈرائینگ روم میں کھلتا تھا۔ دروازہ آدھا کھلا تھا۔ آدھا بند تھا۔ آدھے کھلے دروازے پر ایک پردہ بس اتنا ہٹا ہوا تھا کہ اس سے ملحقہ، ڈرائینگ روم کا ایک گوشہ سا نظر آ رہا تھا۔ ایک قیمتی واس میں ایک تپائی اور دیوار پر ایک تصویر۔ ایک باوقار وجیہہ مرد کی تصویر جو اجودھپوری برجس پہنے ہوئے ہاتھ میں ایک بندوق لئے کھڑا تھا۔

"وقت کیا ہے؟" رضیہ نے کانپ کر مجھ سے پوچھا۔

میں نے گھڑی دیکھ کر بتایا۔ "ساڑھے چار بجے ہیں۔!"

وہ کانپ کر بولی۔ "ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔"

اس نے اتنے مایوس اور ناامید لہجہ میں کہا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

دو گھنٹے۔ ؟ کا ہے کے لئے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے خشک

ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

"وہ تصویر جو تم نے ابھی دیکھی۔ جواب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ کنور راج بہادر سنگھ کی ہے۔......!"

چند لمحوں کے لئے رانی نے میری طرف سے منہ پھیر کر بائیں جانب کی کھڑکی میں دیکھا۔ جو ایک ڈھلوان باغ میں کھلتی تھی۔ باغ میں فوارے تھے ــــ اور وہ شریر بچوں کی طرح دھوم مچا رہے تھے۔ اور سورج کی روشنی میں کھلکھلا کر ہنستے تھے۔ اس کمرے سے باہر دنیا بے حد جوان تھی۔

میں نے رانی کی نگاہوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ رانی اس وقت اپنی خوابگاہ سے باہر کہیں جا چکی ہے۔ یکایک ایک گہری آہ اس کے ہونٹوں سے نکلی۔ اور یادوں میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

اُن دنوں دنیا بہت جوان تھی۔ اسے اٹیم بم نے بوڑھا نہیں کر دیا تھا۔ ان دنوں گیہوں روپے کا بیس سیر ملتا تھا۔ لوگ عورتوں سے عشق کرتے تھے۔ راشن کارڈ سے نہیں — ان دنوں پھول کھلے تھے پات ہرے تھے۔ دل جوان تھا۔ ہواؤں میں ایک نیا پن تھا۔ اب تو ہوا بھی بوڑھی ہو چلی ہے — سسکیاں لے کر کراہتی ہوئی چلتی ہے۔ !

ان دنوں میں بھی جوان تھی۔ تم نے تو مجھے ان دنوں میں نہیں دیکھا۔ ان دنوں میں ایسی نہ تھی۔ یہ جنید ر بدن جو اب دھواں سا ہو رہا ہے۔ ان دنوں چنبیلی کی طرح سبک اور حسین تھا۔ سارے میں نرگاؤں کی راجکماری کی دھوم تھی۔ میں اور ارمیلا۔ جو میری چھوٹی بہن تھی۔ اور مجھ سے عمر

میں دو سال چھوٹی تھی - اور دو گنی حسین تھی۔ مجھ سے --- ہم اور ادھر جدھر سے گزر جاتے تھے ٹھنڈی سانسوں کا اک غبار سا پیچھے چھوڑ جاتے تھے --- ہائے کیسے دن تھے وہ جب لپنے پسینے کو سونگھ کر نشہ ہو جاتا تھا - آجکل کچھ عورتیں جوان نہیں ہوتیں۔ جوان ہونے سے پہلے بوڑھی ہو جاتی ہیں - بوڑھی ہونے سے پہلے نوکری کر لیتی ہیں - اور اپنے شوہر سے زیادہ پراویڈنٹ فنڈ کا خیال کرتی ہے --- ان کی نگاہوں میں کوئی مرد نہیں ہے۔ محض ایک سیکورٹی ہے --- بڑھاپے کی سٹھیائی یہ عورتیں بھلا عشق کریں گی ؟ عشق کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دل کے پات ہرے ہوں - پر جب پیدا ہونے سے پہلے ہی پتے مرجھا جائیں اور پھول کمہلا جائیں تو عشق کون کرے - ؟

ایک لمحہ کے لئے رلی کے لہجہ اور چہرے پر تیز سی تلخی اور نفرت کی اک گہری جھلک پیدا ہوئی - پھر اگلے چند لمحوں میں دھیرے دھیرے بجھ گئی - اس کا چہرہ نرم پڑ گیا - اور ایک میٹھی مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی -

تم بھی یہ بات میں مان لوں گی کہ کوئی بھی عمر ہو - کوئی بھی زمانہ ہو - کوئی بھی ملک ہو - عشق تو عورت ہی کرتی ہے - مرد زیادہ سے زیادہ پیار کر سکتا ہے - مگر عشق عورت ہی کرتی ہے - کیونکہ مرد جسم ہے اور عورت روح ہے - اس لئے

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم نے عورت ہو کر اس دنیا میں کیا کیا۔ تو حالانکہ میں بہت سے کام گنا سکتی ہوں۔ — میں نے زرگاؤں کے علاقے پر حکومت کی جیسے بارہ سو سال سے میرے آباؤ اجداد کرتے آئے تھے — پھر جب آزادی آئی۔ تو میں اسی علاقے سے پارلیمنٹ کی ممبر چن لی گئی۔ اور پھر اسی علاقے پر میں دوسرے طریقے سے حکومت کرنے لگی۔ میں نے رفاہ عام کے بہت سے کام کیے۔ اب تک پچاس لڑکیوں کی شادی اپنے خرچ سے کر چکی ہوں۔ میں نے مندر بنوائے اور تالاب۔ اور ہر سال اپنے خاوند کی برسی پر پانسو براہمنوں کو کھانا کھلاتی ہوں۔ بدری نارائن سے کنیا کماری تک میں تمام تیرتھوں کی یاترا کر چکی ہوں اور زرگاؤں کے علاقے کی ہر آبادی میں ہر سال اپنے خرچ پر سینکڑوں پیپے گنگا جل کے منگا کے مفت تقسیم کرتی ہوں۔ کیونکہ اس سخت کوش۔ سخت گیر سنگلاخ پہاڑی علاقے میں گنگا جل کا ملنا نایاب ہے۔ اور گنگا جل منہ میں ٹپکائے بغیر کوئی ہندو کیسے شانتی سے مر سکتا ہے۔؟ میں نے دس آدم خور چیتے مارے ہیں۔ اور شاید میں ہندوستان کی اور غالباً دنیا کی پہلی عورت ہوں جس نے اپنے ہاتھ سے اتنے آدم خور چیتے شکار کیے ہیں۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ آج تک کوئی خونخوار۔ جنگلی جانور میری رائفل کی زد میں

آیا ہو۔ اور جان بچا کر چلا گیا ہو۔ میں نے گیتا کی تفسیر لکھی ہے۔ اور مجھے چھایا وادی کوتا سے بہت لگاؤ ہے۔ ہر سال اپنی گڑھی میں ایک شاندار، کوی سمیلن کرتی ہوں جس میں صرف چھایا وادی شاعروں کو مدعو کرتی ہوں۔ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے ـــــ لیکن اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم نے اپنی زندگی میں کیا کیا ہے۔ تو میں یہی کہوں گی کہ میں نے عشق کیا ہے۔ اور ٹوٹ کر کیا ہے۔

وہ چپ ہو گئی۔ میں مڑ کر کنور راج بہادر سنگھ کی تصویر کو دیکھنے لگا۔ جو چاندی کے فریم میں لگی ہوئی نظر آرہی تھی۔ جہاں میں بیٹھا تھا۔ وہاں تصویر آدھی پردے کی اوٹ میں تھی۔ آدھی نظر آرہی تھی۔ پھر بھی جو کچھ نظر آرہا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے یہ آسانی سے باور کیا جاسکتا تھا کہ کنور راج بہادر سے کسی نے ایسی ہی محبت کی ہوگی۔ میں نے ایسی وجیہہ شبیہہ بہت کم دیکھی ہے۔

"میں نے اسے کالڑا کے گھنے جنگلوں میں پہلی بار دیکھا۔ کالڑا کے جنگل زرگاؤں کے علاقے اور ہرگاؤں کے علاقے کے عین درمیان واقع ہیں۔ اور دونوں ریاستوں کے بیچ میں ایک طرح کی سرحد کا کام دیتے۔ ان جنگلوں میں کاشت نہیں ہو سکتی اور درخت نہیں کاٹے جاسکتے اور کوئی آبادی نہیں بنائی جاسکتی یہ جنگل صرف شکار کے لئے محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ اور ان میں

صرف ہرگاؤں کے تعلقے اور نذرگاؤں کی ریاست کے شاہی خاندان کے افراد تہ کار کھیل سکتے ہیں۔!

ان ہی جنگلوں میں پہلی بار میں کنور راج بہادر سے ملی۔ وہ شاید اپنے ساتھیوں سے کٹ گیا تھا۔ اور ایک چیتے کا اکیلا سامنا کر رہا تھا۔ اور اس کی رائیفل جام ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا دو دفعہ کلک کلک کی آواز آئی۔ مگر رائفل نہیں چلی اور مغرور چیتا کنور راج پر جست لگانے کے لئے اپنے پچھلے پنجوں پر بیٹھ گیا۔ بس چند لمحوں کا معاملہ تھا۔ وہ جست لیکر ہوا میں اڑ یگا۔ اور کنور راج کو اپنے پنجوں میں دبوچ لے گا۔! میں کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اور میں ایسی جگہ پر کھڑی تھی کہ میں اپنی رائیفل کے ایک ہی وار سے چیتے کو ختم کر سکتی تھی۔ مگر میں وہیں کھڑی رہی۔ کنور راج نے ایک لمحہ کے ہزاروں حصہ میں مجھے کھڑے دیکھا اور ہم دو اجنبیوں کی آنکھیں پہلی بار چار ہوئیں۔ وہ پھر چیتے کی طرف دیکھنے لگا۔ اور جب چیتے نے جست لگائی تو کنور راج اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ چیتے کا وار خالی گیا۔ چشم زدن میں کنور راج نے اپنی رائیفل کو الٹا پکڑ لیا تھا۔ اب وہ اپنی رائیفل کے کندے سے چیتے پر پل پڑا۔ بڑی شاندار لڑائی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دو چیتے لڑ رہے ہیں۔ اور میرے لئے لڑ رہے ہیں۔ اور میں وہاں کھڑی مبہوت تک رہی

تھی۔ کنور راج کی چھاتی اور بایاں بازو۔ اور پیٹھ کا ایک حصہ لہو لہان ہو چکا تھا۔ مگر وہ دلیری اور ہوشیاری اور حیرت انگیز جیداری سے لڑے جا رہا تھا۔ اس لڑائی کے دوران کئی بار میری اور اس کی آنکھیں ملیں —— نظریں چار ہوئیں۔ ایک لمحہ میں اس لڑائی کا فیصلہ میں کر سکتی تھی۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ اگر کنور راج کی نگاہوں میں ایک سوال تھا۔ تو میری نگاہوں میں اس کا جواب بھی تھا۔

آخری بار ایسی پھرتی سے جس پر چیتا بھی رشک کرے کنور راج نے حملہ کرنے والے چیتے کے نیچے سے پھسل کر ایک پہلوان کی طرح اسے چت کر دیا —— پھر دونوں ہاتھوں سے رائفل پکڑ اس نے چیتے کی کھوپڑی پر ایسا بھرپور وار کیا کہ کھوپڑی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اور چیتے کا بھیجہ اس کے سر کے بالوں سے باہر بہہ نکلا —— ایک آخری غراہٹ کے ساتھ چیتا ختم ہو گیا۔ کنور راج چند لمحوں تک ہانپتا کانپتا ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر وہیں چیتے پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

میں اسے جنگل سے اٹھا کر گڑھی لے آئی۔ آناً فاناً اس کے خطرناک طور پر زخمی ہونے کی خبر دونوں تعلقوں میں پھیل گئی۔ کیونکہ کنور راج ہر گاؤں کے تعلقے کا مالک تھا۔ اور میں زر گاؤں کی رانی تھی۔ دونوں تعلقوں سے رعایا اسکی خیریت معلوم کرنے کے لئے ٹوٹ پڑی۔ مگر ڈاکٹروں کے مشورے کی بنا پر میں نے اسے کسی سے ملنے نہ دیا۔

دس دن تک وہ زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا رہا۔ اس نے شدید زخم کھائے تھے۔ بائیں کندھے پر: اور دل کے قریب۔ ذرا اوپر پسلیوں پر۔ اگر چیتے کا پنجہ ذرا نیچے پڑ جاتا تو کنور راج کا خاتمہ یقینی تھا۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا۔

اس کے سینے پر زخم تھے اور جانگھ پر بھی۔ وہ زخموں

سے بچا پڑا تھا۔ اور پہلے دس دن تک تو ڈاکٹر بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ ان زخموں سے جانبر ہو سکے گا کہ نہیں......؟ مگر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ زندہ رہے گا۔ اسے میری خاطر زندہ رہنا ہی پڑیگا۔ اس نے چیتے کو شکست نہیں دی تھی۔ اس مجھے بھی شکست دی تھی۔ فرق اتنا ہے۔ کہ جب مرد شکست کھاتے ہیں تو صلح کرتے ہیں۔ جب عورت ہارتی ہے تو اپنے کو مکمل طور پر سپرد کر دیتی ہے۔

ان دس دنوں میں میں نے دن رات ایک کر کے اس کی تیمار داری کی۔ میں دن میں جاگی اور رات کو جاگی۔ اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی ایک پلک بھی جھپکی ہو۔ کیونکہ یہ اب میری لڑائی تھی۔ موت کے ساتھ۔ اور مجھے اس لڑائی کو ہر صورت جیتنا تھا۔ حالانکہ نرسیں تھیں اور ڈاکٹر تھے۔ اور علاج معالجہ کا بہترین انتظام تھا۔ مگر یہ میری لڑائی تھی۔ اس لئے میں چوبیس گھنٹے مریض کی پٹی سے لگی رہتی تھی۔ اور ایک پلک نہ جھپکی تھی۔ ان دس دنوں میں میں نے تو زندہ رہنا ہی ہے۔ میری خاطر۔ کنور راج ——! ارملا میری چھوٹی بہن بار بار میرے پاس آتی تھی اور مجھ سے آرام کرنے کیلئے کیسی کیسی منت کرتی تھی۔ ارملا میری بہت ہی چہیتی ہے۔ اور میں اس کی کوئی بات ٹال نہیں سکتی۔ اور تھکن اور نیند سے

میرا سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ لیکن میں پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ اگر میں ایک لمحہ کے لئے کنور راج کے بستر سے ہٹی تو موت کا چیتا اسے کھا جائے گا۔

دسویں صبح کے وقت میں کہہ نہیں سکتی کب اچانک میری آنکھ لگ گئی اور میں اس کے بستر کے قریب آرام کرسی پر بیٹھی بیٹھی سو گئی ـــــ پہلی نیم غنودگی میں مجھے ایسا لگتا جیسے دھیرے قدموں سے ارملا میرے پاس آ گئی ہو۔ اور پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہو۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ کچھ معلوم نہیں۔ میں کب تک سوئی۔

اتنا یاد ہے کہ جب جاگی تو دن ڈوب چکا تھا شام ہو رہی تھی۔ خادماؤں نے کمرے کے لیمپ روشن کر دیئے تھے۔ اور ان کی جھلملاتی ہوئی سنہری روشنی میں جب میری آنکھ پہلی بار کھلی تو میں نے دیکھا کہ کنور راج کو ہوش آ گیا ہے! اور ارملا میری چھوٹی اور چہیتی بہن اس پر جھکی ہوئی چاندی کے چمچہ سے کنور راج کے ہونٹوں میں سنگترے کا رس ڈال رہی ہے۔ اور اس کے شانوں تک کٹے ہوئے بال ارملا کے بار بار جھکنے سے کنور راج کے رخسار پر یوں جھک جاتے ہیں۔ جیسے ترستی ہوئی چوٹیوں پر برسات کے گھنیرے اور کالے بادل جھک جاتے ہیں۔

کنور راج بہت مضمحل اور کمزور دکھائی دیتا تھا۔ مگر

ارملا کی دلنواز مسکراہٹ کو اپنے چہرے کے اسقدر قریب دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی ایک دلنواز کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ایک بچے کی طرح ہونٹ کھولے ارملا کے ہاتھوں سے رس پی رہا تھا۔ اور جس وارفتگی سے ارملا کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ایک نگاہ ہی میں پہچان گئی۔ میں لڑائی ہار گئی۔ ارملا نے شب خون مارا تھا۔

میں یہ نہیں کہتی اس نے دیدہ و دانستہ ایسا کیا تھا۔ شاید مجھے سوتے ہوئے دیکھ کر اس نے مجھے خوش کرنے کیلئے کنور راج کی تیمارداری سنبھال لی تھی۔ شاید اسی دن کنور راج کو ہوش آیا تھا۔ میں جو مسلسل نو روز سے جاگ رہی تھی۔ شاید اسی دن میری نیند کو آنا تھا۔ اور ہونی کو ہونا تھا۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔؟ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جب میں نے آنکھ کھولی اور ارملا اور کنور راج کو آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھا۔ تو ایسا لگا جیسے ان دونوں کی جان پہچان چند گھنٹوں کی نہیں ہے۔ چند برسوں کی ہے۔ چند صدیوں کی ہے۔ شاید ہمیشہ سے ہے۔ دل میں اک خنجر سا اترتا محسوس ہوا۔ مگر میں ضبط کر گئی۔ میں نے اپنے زخموں سے رستا ہوا لہو آپ ہی پی لیا۔ ہونٹ سی لئے اور یوں ظاہر کیا۔ جیسے میں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔

.........!

اس دن سے میں آپ ہی آپ اس سے پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ اور ارملا آگے بڑھتی چلی گئی۔ ابھی کچھ ہوا نہ تھا۔ میں نے ایک لفظ محبت کا نہیں کہا تھا۔ دس دن جب تک وہ بیہوش رہا۔ میں جیسے اسے اپنی گود میں لئے بیٹھی رہی۔ اور دل ہی دل میں اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کر دیا۔ وہ کیسے سمجھ سکتا تھا؟ ارملا بھی کیسے جان سکتی تھی۔ کیونکہ ابھی کچھ ہوا نہ تھا۔ ابھی ایک لفظ، جان پہچان یا واقفیت کا یا ایک نگاہ یا ایک تبسم تک ہمارے درمیان مشترک نہ ہوا تھا۔ یہ کہ میں نے اسے اپنے دل میں جگہ دی تھی۔ اس کا علم صرف مجھے تھا۔ یا میرے دل کو۔!

مگر صرف میرے قدم پیچھے ہٹے تھے۔ میری محبت پیچھے نہیں ہٹی تھی۔ میں پیچھے ہٹنے والی عورتوں میں سے نہیں ہوں۔ اکثر لوگ یا تو جھک جاتے ہیں یا ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں نہ جھک سکتی ہوں۔ نہ ٹوٹ سکتی ہوں۔ میں صرف مر سکتی ہوں۔

تم مجھے نہیں جانتے۔ میں نے آج تک ہار نہیں مانی۔ مگر ارملا تو میری سگی بہن تھی۔ میری اپنی چہیتی۔ میں اس سے کیا کہتی۔؟ تم نے ارملا کو نہیں دیکھا —— دیکھتے ہی رہ جاتے۔ کوئی اس سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایسی بھولی ایسی معصوم۔ ایسی پیاری ایسی نازک ایسی سبک جیسے اس کا جسم نسیم

سحری سے نرشا گیا ہو۔ اسے کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ مجھ سے اتنا پیار کرتی تھی۔ اتنا مجھ سے ڈرتی تھی۔ کہ ممکن ہے میں اس سے کچھ کہتی تو وہ وہیں سہم جاتی۔ اس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو نکل پڑتے یا وہ وہیں میرے سامنے کھڑے اپنے جرم کے احساس کی وحشت سے مر جاتی ــــ! زندگی میں آج تک اس کو صرف پیار ہی پیار ملا تھا۔ اس کے مرحوم ماں باپ نے پھر ان کے بعد اس کی بڑی بہن نے اسے صرف پیار ہی دیا تھا۔ اور وہ بھی صرف اسی لائق تھی کہ کوئی اسے پیار کرے یا وہ کسی سے پیار کرے۔ وہ نہ میری طرح حکومت کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ نہ شکار کھیلنے کے لئے۔ نہ پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے لئے۔ نہ کسی رعب۔ جاہ۔ طنطنے کے لئے........ وہ صرف پیار کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس لئے میں نے ہولے ہولے اپنے آپ کو ہٹا لیا۔ مگر مکمل طور پر ہٹا نہ سکی۔ میں بھی اس کی تیمارداری میں لگی رہی۔ ارملا بھی۔ پھر دھیرے دھیرے یوں ہوا اور بالکل غیر محسوس طریقے پر ہوا۔ جیسے ارملا کے پاس زیادہ وقت ہے۔ اسے دینے کے لئے اور میں ریاست کے کام دھندوں میں مصروف ہوں۔ اب میں اس کے پاس بیٹھتی تھی۔ مگر محض اپنے دل کو جلانے کے لئے اپنے شبہوں کو بڑھانے کے لئے اپنے زخموں پر نمک لگانے کے لئے۔ اس جلنے تپنے کڑھنے میں بھی

اک مزا ہے۔ اس لذت کو وہی جانتا ہے۔ جس نے کبھی اپنے محبت کے زخموں کو خود ہی چھیڑا ہو۔

میں چھپ چھپ کر ان کی باتیں سنا کرتی تھی۔ ایک دن کنور راج ارملا سے پوچھ رہے تھے۔

"تم کہتی تھیں کہ رانی جی نے نو دن تک دن رات جاگ کر میری تیمارداری کی۔ اور وہ اس وقت کسی دوسرے کو میرے قریب نہ آنے دیتی تھیں۔ !"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ !" ارملا نے جواب دیا۔

تو اب وہ مجھ سے اتنی دور دور کیوں رہتی ہیں۔ ؟"

"ریاست کے کام ہوتے ہیں۔ !"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے ـــــ" کنور راج نے سر جھکا لیا۔ پھر سوچ سوچ کر بولا۔ "مگر تمہاری بہن بڑی سنجیدہ رہی ہیں۔ !"

"ہاں سنجیدہ تو ہیں۔ مگر کیونکہ ریاست کا کام وہی دیکھتی ہیں۔" ارملا بولی۔ "مجھے تو کچھ آتا ہی نہیں۔ میں تو کچھ کر بھی نہیں سکتی۔ سب وہی نہیں کرتی ہیں۔ !"

"کیا ان کی زندگی میں آج تک کوئی مرد نہیں آیا۔ ؟"

"میں نے تو دیکھا نہیں۔ !"

شاید وہ محبت نہیں کر سکتیں ! " کنور راج ارملا کا

ہاتھ دیکھتے ہوئے بولا۔ "ان کی شخصیت میں وقار اور دبدبہ زیادہ ہے۔ ان کی عزت کی جا سکتی ہے۔ ان سے محبت نہیں کی جا سکتی!"

وانہ۔ تم کیسی باتیں کرتے ہو ـــــ میں تو ان سے بہت محبت کرتی ہوں۔" ارملا نے احتجاج کیا۔

"مجھ سے بھی زیادہ؟" کنور راج نے پوچھا۔

"تمہاری بات اور ہے۔" ارملا کی آنکھیں جھک گئیں۔ اور وہ بڑے کمزور لہجہ میں بولی۔

"کنور راج نے اس کی تھوڑی کے نیچے اپنی انگلی رکھ کر اس کے چہرے کو اتنا اونچا کیا کہ ارملا کی ڈبڈبائی ہوئی نیلی آنکھیں اس کی اپنی سیاہ آنکھوں کے بالکل سامنے آ گئیں۔ کنور راج نے ارملا کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں کے ہالے میں لے لیا۔ اور بڑے غور سے ان آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"تمہاری آنکھوں سے مجھے ڈر نہیں لگتا۔ تمہاری آنکھیں ایسی ہیں جیسے جھیل میں نیل کمل کھلے ہوئے۔ مگر تمہاری بڑی بہن کی آنکھوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ وہ گہری سنہری آنکھیں کسی چیتے کی آنکھیں معلوم ہوتی ہیں۔!"

میں اس سے زیادہ سن نہ سکی۔ بے آواز قدموں سے وہاں سے بھاگ گئی۔ اور دوڑ کر اپنی خواب گاہ میں چھپ گئی۔ میں نے آنسوؤں میں تیرتی ہوئی اپنی سبز پتلیوں کو دیکھا۔

اس دنیا میں کوئی کیا بدل سکتا ہے۔؟ نہ اپنی فطرت، نہ اپنی آنکھوں کا رنگ، نہ اپنے وحشی دل کے ڈھنگ! اچھا تو میری آنکھیں چیتے کی ہیں۔؟ لیکن کیا تم نے کبھی کسی چیتے کو روتے دیکھا ہے۔ میری طرح روتے ہوئے دیکھا ہے۔؟ آنسوؤ۔ بند ہو جاؤ۔ چیتے رویا نہیں کرتے........" میں نے آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے۔ واقعی مجھے چیتے ہی کی طرح بہادر اور بے رحم ہونا پڑیگا۔

تین ماہ میں اس کے زخم بھر گئے۔ اور وہ اس قابل ہوگیا۔ کہ کبھی میرے سہارے کبھی ارملا کے سہارے پائیں باغ میں چل سکے۔ رستے میں ادھر آتے ہوئے چھپتے ہوئے برآمدے کے باہر تم نے وہ چھوٹا سا باغ ضرور دیکھا ہوگا۔ جس میں اخروٹ۔ شاہ بلوط اور تنگ کے درخت ہیں۔ خاص طور پر اس کے بیٹھنے کی جگہ وہ تنگ کا درخت تھا۔ جو باغ کے مغربی جانب واقع ہے۔ کھڈ کی طرف۔ جسپر انگور کی بیلیں سب سے گھنی اور گہری ہیں۔ اور جسکے قریب سنگ مرمر کی دیوار ہے۔ جو باغ کو کھڈ سے جدا کرتی ہے۔ اس باغ کے نیچے کھڈ چار ہزار فٹ گہری جاتی ہے۔ اور یہاں سے بان گنگا کی ندی اور اس کی وادی اور اس سے پرے ہمالیہ کے اونچے اونچے برفیلے پہاڑ دو

کا کہستانی سلسلہ چلتا ہے۔ کنور راج کو وہ جگہ بہت پسند تھی۔
اور جب وہ اس قابل ہوا۔ کہ اپنے کمرے سے اٹھ کر باہر چل
پھر سکے۔ تو وہ اکثر یہاں آکر ٹہلتا تھا۔ کبھی آرام کرسی پر بیٹھ
جاتا تھا۔ کبھی یہیں صبح کا ناشتہ کرتا تھا۔ شام کی چائے
تو اکثر یہیں ہوتی تھی۔ ! چاندنی راتوں میں اکثر میں نے اسے
ارملا کے ساتھ ٹہلتے ہوئے دیکھا ہے۔ جب ان دونوں کا خیال
ہوتا کہ میں اپنی خواب گاہ میں پڑی سو رہی ہوں۔ ! میں نے کنور
راج کو ارملا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ٹہلتے دیکھا ہے۔ دونوں ایک
دوسرے سے لگے ہوئے ایک دوسرے پر جھکے ہوئے۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا۔ جیسے وہ تنگ کا درخت ہے۔ ارملا انگور کی بیل
ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح لپٹ گئے ہیں جیسے
اب کبھی جدا نہ ہوں گے۔ اور ان دونوں کے اوپر نیا نویلا
چاند کسی قاتل کے خنجر کی طرح خوبصورت۔ اور صحن کے
پر دول میں چھپی ہوئی دیکھتی ہوئی روتی ہوئی۔ تم سوچ ہی
نہیں سکتے ڈاکٹر گھوش وہ دن کتنے خوبصورت تھے جب
میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی امیدوں کا خون ہوتے
دیکھا تھا۔ کبھی ارملا سنگ مرمر کے چبوترے پر چڑھ جاتی۔ اور
اس پر کھڑے ہو کر تنگ کے پیڑ سے لٹکتے ہوئے انگور کے خوشوں
سے انگور توڑ توڑ کے کھانے لگتی۔ ایک دانہ اپنے منہ میں اور

ایک دانہ کنور راج کے منہ میں۔ ایک آنسو میرے رخسار سے بہتا ہوا ـــــ ہوا ہولے ہولے دھن بجاتی ہوئی ـــــ دور نیچے پان گنگا کا دھیما دھیما آرکسٹرا۔ اور چبوترے پر کھڑی پاؤں میں پائل کھنکھناتی ہوئی ـــــ ناچتی ہوئی۔ رچھالی ہوئی ارملا ـــــ اور چاند کی سیمیں قلم سے ترشا ہوا تیکھا میرے کنور راج کا رخ ـــــ مسکراتا ہوا۔ ہنستا ہوا ـــــ بیحد حسین اور بے پناہ جوان جسم ـــــ ناچتی ہوئی ارملا کو اپنی باہوں کی گود میں اٹھا لینے والا ـــــ اور پھر اپنی دونوں آنکھیں بند کر کے اس کے ہونٹوں پر جھک جانے والا ـــــ واقعی اس درد کی کوئی منزل نہیں ہے ـــــ زخم جتنا گہرا ہوتا ہے ـــــ اتنا ہی مزا دیتا ہے۔

پھر سوچ سوچ کے میرے دل میں خیال آیا۔ کہ ارملا کے حسن کی کاٹ کوئی اس سے بہتر حسن ہی کر سکتا ہے۔ اور یہ سوچتے ہی میرا ذہن چمپا کلی کی طرف گیا۔

دیکھیے، یوں تو رانیاں اور راجکماریاں بہت حسین ہوتی ہیں۔ مگر ان کا حسن چیختا چلاتا ہوا حسن نہیں ہوتا ہے ـ۔ وہ کچھ تو حسین ہوتی ہیں۔ کچھ خاندانی وجاہت اور دبدبہ ان کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے ـــــ کچھ پروپیگنڈا ـــــ کچھ دیکھنے والے کا تصور ـــــ ایک معمولی سی قبول صورت راجکماری

بھی کیا سے کیا دکھائی دینے لگتی ہے —— میں مانتی ہوں۔ اربلا ایسی خوبصورت نہ تھی —— وہ واقعی حسین تھی۔ مگر وہ مادرِ لنزرو تو نہ تھی۔ وہ چمپا کلی بھی نہ تھی۔!"

"یہ چمپا کلی کون ہے۔؟"

"ہر ریاست میں ایسی لڑکیاں رکھی جاتی ہیں۔ جن کا بھیرا ہوا بے پناہ حسن اپنے سستے عشوہ و انداز سے مرد کو بے قابو کر سکتا ہے۔ اپنے ہاں یہ روایت بہت پرانی ہے۔ اور راجہ اندر کے وقت سے چلی آرہی ہے۔ جنہوں نے گرو وشوامتر کی تپسیا سے اپنا سنگھاسن ڈولتا دیکھ کر مینکا اپسرا کو ان کی تپسیا بھنگ کرنے کے لیے بھیجا تھا —— وہ کہانی تو تمہیں یاد ہو گی۔"

"میں نے مسکرا کر آہستہ سے سر ہلا دیا۔

"بس اسی دن سے ہر راج میں ایسی لڑکیاں رکھی جاتی ہیں۔ نام بدلے جاتے ہیں ان کے ہر عہد میں —— لیکن کام نہیں بدلتا ہے —— دیوتا انہیں اپسرا کہتے ہیں۔ کوئی انہیں دیو داسی کہتا ہے۔ کوئی کنیز کہتا ہے —— آجکل وہ کال گرل یا کانٹیکٹ گرل کہلاتی ہیں —— مگر محض نام بدلنے سے کہیں انسان بدلتے ہیں۔ یا ان کا پیشہ بدلتا ہے۔؟ بات تو وہی ہے۔!"

چمپا کلی ایک ایسی ہی لڑکی تھی۔ اور میرے ہاں اس

کام کے لئے ملازم تھی۔ اسے صرف مشکل ترین مرحلوں میں ڈالا جاتا تھا۔ اور آج تک اس کا۔ ریکارڈ تھا کہ وہ کبھی ناکام نہیں لوٹی تھی۔ ایک ہی ہلے میں تو بہ توڑ دیتی تھی ــــــ اور مرد کو اس درجہ رام کر لیتی تھی کہ وہ اس کے ہاتھ سے گھاس بھی کھانے پر راضی ہو جاتا تھا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اسے خود کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا ــــــ بس وہ ایک بار مرد کے قریب سے ترچھی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ اس کے بعد اسے کچھ نہیں کرنا ہوتا تھا ــــــ اسی لئے تو اسے ہمیشہ مردوں کی نگاہوں سے دور محل کے زنانے میں الگ رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ ہم ہمیشہ اسلحہ خانے میں رکھتے ہیں ــــــ اور صرف ضرورت کے وقت استعمال کرتے ہیں۔!

مگر اس بار میں چمپا کلی کو استعمال کرتے وقت بیحد خائف تھی۔ کنور راج بچے تو ہیں نہیں کہ معاملے بندی کو نہ سمجھ سکیں۔ یا شطرنج کی اس چال کو جس کا مہرہ چمپا کلی تھی۔ ممکن ہے ان کا شبہ مجھ پر پڑے اور یہ بہت غلط بات ہو گی ــــــ خائف ہونے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ کنور راج ارملا کی محبت میں اسقدر ڈوبے ہوئے تھے کہ مجھے یقین نہیں تھا وہ کبھی چمپا کلی سے التفات کریں گے۔ مگر کوشش کرنے میں ہرج کیا ہے ــــــ اگر اپنا حسن ہار جائے تو کسی دوسرے کا حسن

مستعار لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ عشق اور جنگ میں سب جائز ہے۔ اور ایک بار بھی بھولے سے بھی اگر کنور راج نے چمپا کلی سے التفات ظاہر کیا ـــــ تو میں خود ارملا کو وہاں لے جا کر اپنی آنکھوں سے اسے سب دکھا دوں گی ـــــ!

سب سے پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ چمپا کلی کو ارملا کی تحویل میں دیدیا۔ اب وہ ارملا کی باندی ہو گئی ـــــ مگر ہر روز مجھے رپورٹ دیتی رہتی تھی۔

"آج کچھ نہیں ہوا۔!"

"آج بھی دن خالی گیا۔!"

"راجکماری جی تو مجھے محلسرائے سے باہر ہی نکلنے نہیں دیتیں ـــــ کہیں کنور راج کی نظر مجھ پر نہ پڑ جائے۔" وہ اٹھلا کر کہتی۔

"آج تو میں نے توبہ توبہ ـــــ" چمپا کلی نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا ـــــ "ایسی ہمت دکھائی کہ پسینے چھوٹ رہے ہیں۔ اب تک۔ میں نے راجکماری جی سے صاف کہہ دیا۔ آپ ڈرتی ہیں شاید مجھ سے!"

ارملا جی کا چہرہ غصّے سے لال ہو گیا ـــــ بولیں۔ "آج شام کی چائے تم پلاؤ گی کنور راج کو پائیں باغ میں موجود رہنا۔ اسی دن میں نے چائے پلائی۔ کنور جی مجھے دیکھتے رہے۔

چائے کے ساتھ ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے بھی پیتے رہے میں وہ نگاہیں پہچانتی ہوں۔" چمپا کلی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔!

دوسرے دن چمپا کلی پھر آئی۔!

"آج تو ارملا جی نے مجھے کنور جی کی خوابگاہ میں بھیج دیا۔ دودھ کا گلاس دیکر ـــــ میں رکھ آئی۔!"

"کنور جی کمرے میں تھے؟" میری سانس رکنے لگی۔

"ہاں تھے ـــــ!"

"دیکھا انہوں نے۔؟"

"ہاں دیکھا۔!"

"ہاتھ بھی پکڑا۔؟" میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔!

"نہیں۔ بس دیکھتے رہے۔ میں نے دودھ کا گلاس تپائی پر رکھ کر جالی سے ڈھانپ دیا۔ تپائی کو ان کی چھپر کھٹ کے قریب لگا دیا۔ جھکنے میں اور پھر جھک کر اوپر اٹھنے میں آپ جانتی ہیں دنیا کی کوئی عورت میرا مقابلہ نہیں کر سکتی ـــــ میں دیکھ رہی تھی کہ کنور جی کا چہرہ فق تھا۔ اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں کچھ دیر ان کی چھپر کھٹ کے پاس کھڑی تپائی ٹھیک کرتی رہی۔ جب وہ کچھ نہیں بولے تو کولہے مٹکا کر چلنے لگی۔ اور دو قدم چل کر مڑ کر انہیں ترچھی نظروں سے دیکھکر کہنے لگی ـــــ "میں جاؤں۔؟"

"وہ پہلے تو کچھ بولے نہیں۔ پھر بولنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر کار کہنے لگے۔ ذرا میری چھپر کھٹ پر چڑھ کر اس روشنی کو ٹھیک کرتی جاؤ۔ جو میرے سر کے پیچھے ہے۔ پڑھنے میں روشنی کا زاویہ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔!"

میں نے لہنگے کو ٹخنوں سے اوپر گھٹنوں تک چڑھا لیا۔

اور چھپر کھٹ پر چڑھ گئی۔

میں ان کے سر کے قریب کی روشنی ٹھیک کرتی رہی۔

اور میرا خیال ہے کہ وہ میرے ٹخنوں کی گولائی اور میری صندلی پنڈلیوں کی طرف دیکھتے رہے ہوں گے ــــــ میں ہر پل اپنی ٹانگوں پر ان کے لمس کی منتظر تھی۔ مگر جانے وہ کیسے صبر کر گئے۔!"

"پھر ــــ؟" میری آواز بچھو کے ڈنک کی طرح میرے حلق سے باہر نکلی۔

"پھر میں چھپر کھٹ سے نیچے اتر آئی۔! اور ان کے پائنتی کھڑی ہو کر بڑی ادا سے بولی۔ "آپ کے پاؤں دبا دوں!"

وہ بڑی مشکل سے بولے۔ "کل رات کو آنا۔!"

اتنا کہہ کر وہ منہ پر دوپٹہ لے کر زور زور سے ہنسنے لگی۔ "رانی جی مردوں کے پاؤں بڑے چکنے ہوتے ہیں۔ عورت کو دیکھتے ہی پھسل جاتے ہیں۔ مگر عورت ہونی چاہیے۔"

وہ اپنی ایک پازیب کو دوسری پازیب سے بجاتے ہوئے
بولی۔!

"اب دیکھیے کل رات کیا ہوتا ہے۔؟" وہ میرے
سامنے انگڑائی توڑ لینے لگی۔

میں نے کہا۔ "چل ہٹ۔ دفان ہو مردار.....

......!"

مگر دوسرے دن کے لئے میں نے سب انتظام
کرلیا۔ چمپا کلی کو سب پڑھا لکھا دیا۔ ارملا کو شبہ تک نہ
ہونے پائے۔ کنور جی سے کہنا تم بارہ بجے رات کو آؤ گی۔ بتی
گل کر دیں۔ دروازہ بھیڑ دیں۔ مگر اندر سے بند نہ کریں۔
تم پروتما کو لے کر اندھیرے کمرے میں گھس جانا۔ پروتما
کو چھپر کھٹ کے نیچے چھپا دینا ـــــ جب ہم دستک دیں
گے۔ تو تم چھپر کھٹ سے مت اٹھنا ـــــ پروتما دروازہ
کھول دیگی۔ روشنی ہم لے کر آئیں گے۔ ہمارے ساتھ ارملا
بھی ہوگی۔!"

"سمجھ گئی۔ سمجھ گئی۔" وہ شوخی سے سر ہلا کے بولی۔
"سب سمجھ گئی۔ بے فکر رہیئے۔ رانی جی۔ کل سب ٹھیک
ہو جائے گا۔" اس کی آواز میں لہجہ میں، جذبے کی ایسی
لہک تھی۔ جیسے وہ خود آنے والے کل کے لئے بیتاب ہے۔

"بات کا یہ رخ اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ چمپا کلی کی بیتابی دیکھ کر مجھے کچھ برا سا بھی لگا ــــ مگر کنور راج کو ارملا سے الگ کرنے کا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے سب انتظام کر لیا ــــ پردتما سے کہہ دیا۔ دیوان جی سے کہہ دیا۔ کہ وہ آ کے مجھ سے شکایت کریں۔ ارملا کو میں کل اپنے کمرے میں رات کے بارہ بجے تک روک لوں گی۔ دیوان جی آئیں گے۔ سب ماجرا بیان کریں گے ــــ میں حیرت میں رہ جاؤں گی۔ ارملا کے چہرے کی طرف تکوں گی جس کی آنکھوں میں آنسو ہوں گے ــــ میں باور نہیں کرونگی۔ دیوان جی مجھ سے موقعہ واردات پر جانے کے لئے کہیں گے۔ میں ارملا کو ساتھ لے کر چل دوں گی۔ ایک نظر میں معاملہ ختم ہو جائیگا۔ !

طے تو سب ہو گیا۔ مگر رات بھر نیند نہیں آئی۔ چمپا کلی کا بیقرار اور بیتاب جسم آنکھوں کو ڈستا رہا ــــ صبح ہوئی۔ دوپہر ہوئی۔ شام ہوئی۔ رات ہوئی۔ رات کے بارہ بجے تھے کہ میں بیقرار ہو کر کنور جی کے کمرے کی طرف بھاگی۔ چمپا اس وقت کنور جی کے دروازے تک آ پہنچی تھی۔ اس کا ایک قدم دروازے کے اندر تھا۔ دوسرا دروازے کے باہر ــــ اس کے پیچھے پردتما ایک سیاہ لبادہ اوڑھے کھڑی تھی ــــ

میں نے اندر جاتی ہوئی چمپا کلی کو ہاتھ سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔ اور اسے چابک پر چابک مارنے لگی ـــــ تمہیں ایسا جسم رکھنے کا حق کیا ہے۔ چمپا کلی ؛ تم تو اس کے سینے سے لگ کے سوؤ ـــــ اور میں اس کے قدم بھی نہ چھو سکوں ـــــ تمہیں اس کے ہونٹ کے بوسے ملیں اور میں اس کی گالیاں بھی نہ سن سکوں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ ؟

چمپا کلی پہلے چند لمحے تو حیرت زدہ رہی۔ پھر چیخنے چلانے لگی۔ مگر سر جھکا کے مار کھائے جاتی تھی۔ اور میرے پاؤں کو بار بار ہات لگائے، رحم کی بھیک مانگے جاتی تھی۔ اتنے میں ارملا دوڑی آئی ـــــ اس نے میرے ہاتھ سے چابک چھین لیا۔

"جانتی ہو یہ کیا کر رہی تھی۔ ؟" میں نے ارملا سے کہا۔

ارملا مسکرا کر بولی۔ "جانتی ہوں۔ !"

"کیا جانتی ہو ـــــ ؟" میں نے پھر کر پوچھا۔

"چمپا کلی کنور جی کے کمرے میں جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ !"

"اور یہ جان کر بھی تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ ؟"

"کیوں نہ ہو ـــــ وہ تو اندر ہی نہیں ہیں۔ !"

"اندر نہیں ہیں !" میری آواز میں شدید حیرت تھی۔ اور مایوسی بھی !

"ہاں، انہوں نے آج صبح ناشتے پر مجھے سب بتا دیا تھا۔ وہ تو دوسرے کمرے میں سوئے ہیں۔" ارملا بولی۔ "یقین نہ ہو تو اندر جا کے اطمینان کر لیجئے۔ !"

مگر کمرے کے اندر جانے کی ضرورت نہ پڑی۔ کنور جی خود ہی دوسرے کمرے سے نکل کر مسکراتے ہوئے ہماری طرف چلے آرہے تھے ـــــ چمپا کلی کی طرف دیکھ کر بولے۔

"آپ نے اس پھول سے جسم کو ناحق تکلیف پہنچائی۔ رانی جی۔ یہ جسم کیا چابک کھانے کے لائق ہے۔ ؟ یہ کومل بدن تو گود میں اٹھانے کے لائق ہے ـــــ چلو ـــ چمپا کلی ہمارے کمرے میں چلو۔ آج ہم تمہارا بدن دبائیں گے۔ !"

وہ کھلکھلا کر شوخی اور شرارت سے ہنس پڑے ان کا لہجہ ایک عجب خفتہ سے طنز میں بجھا تھا۔ چمپا کلی مجبور ہو کر پازیب بجاتی وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

رات کے دو بجے ہیں۔ !

آنکھوں میں نیند نہیں ہے۔ چمپا کلی نیچے نالیچہ پر سسک رہی ہے۔ اور پوچھ رہی ہے۔

"آپ نے مجھے کیوں مارا۔ ؟"

"میری مرضی۔ !" میں نے سختی سے اسے جواب دیا۔

وہ رو کر بولی۔ خود ہی پلان بنایا۔ خود ہی فیل

کر دیا۔ !"

"میری مرضی! تم پوچھنے والی کون ہوتی ہو۔ ؟"

"ہمارا بدن دکھتا ہے۔" اس نے شکایت کی۔

"پھر میں کیا کروں۔ ؟"

"ہمیں اور چاہک ماریئے۔ نہیں تو گلے سے لگا لیجیے"۔

میں اسے گلے سے لگا لیتی ہوں۔ اور اس کے ساتھ سسکنے لگتی ہوں۔ اب میں رانی نہیں ہوں۔ وہ میری باندی نہیں رہی اب ہم صرف دو عورتیں ہیں۔ میں اسکا منہ چومتی ہوں۔ وہ مجھ سے پوچھتی ہے۔

"رانی جی آپ نے کبھی پیار کیا ہے۔ ؟"

"تم نے کیا ہے۔ ؟"

"ہاں ہنسی سے کیا ہے۔ !"

"ہنسی کون ہے۔ ؟"

"ہمارے گاؤں میں ایک گڈریا ہے۔ رانی جی۔ میں نے پہلی مار اس سے کھائی تھی۔ پہلا بوسہ اسی کو دیا تھا۔ رانی جی میں اس کو بھولی نہیں ہوں۔ وہی میرا مالک ہے۔ !

میں تجھے تیرے مالک کو سونپ دونگی۔!"

اس کا سارا جسم کانپنے لگتا ہے۔ وہ دونوں باہیں میرے گلے میں ڈال کر میرا منہ چومنے لگتی ہے۔ اور میرے کان میں کہتی ہے۔

"رانی جی آپنے کبھی پیار نہیں کیا۔؟

"نہیں۔!"

"رانی جی آپ کو کسی نے پیار نہیں کیا۔؟"

"نہیں۔!"

رانی جی کوئی آپ سے پیار کرے نہ کرے آپ تو ضرور کسی سے پیار کرلیں۔

میری چیخیں نکل جاتی ہیں۔

"اچھا ہے میں آج عورت بن گئے تمہارے ساتھ رو لی۔ چمپا کلی۔ کل تجھے تیرے گڈریئے کے گھر جہیز دے کر بھجوا دوں گی۔ پھر کوئی دیکھ نہ سکے گا۔ آنسوؤں کا یہ دریا ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔ !

پھر وہ دن بھی آگیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ اس دن ارملا اپنے فوٹو چھوڑ کر، کانپتے ہوئے ہونٹوں اور دھڑکتے ہوئے دل کو لے کر یکایک کھانے کی میز سے اٹھ گئی تھی۔ اور اس کے جانے کے بعد ہی کنور راج نے ارملا کو مجھ سے مانگ لیا تھا۔"

"جہاں تم نے مجھے زندگی دی ہے —— وہاں اس زندگی کی خوشی بھی دیدو۔ !" وہ بولا۔

"میں نے تمہیں زندگی دی ہے۔ ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں —۔ !" اس نے جواب دیا۔ "اگر تم مجھے اس وقت جنگل سے اٹھا کر نہ لاتیں —— جب میں چیتے سے لڑائی کرتا کرتا بیہوش ہو گیا تھا۔ تو اب تک میں کسی جنگلی جانور کا شکار

بن گیا ہوتا۔ جب سے جب تم نے میری یہاں دیکھ بھال کی ہے۔ اس احسان کا بدلہ میں اس طرح چکا سکتا ہوں کہ ایک احسان اپنے اوپر اور لاد لوں ـــــ زندگی کا سب سے بڑا احسان ! کردو گی۔ ؟"

" ضرور کردوں گی۔ !" مجھے اپنی آواز بڑی عجیب اور جھوٹی سی لگی۔ !

" تو مجھے اپنا بنا لو۔ !"

میں چونک گئی۔ دور دل کے اندر کی کسی اندھیری گہری کھڈ میں پڑی ہوئی کسی امید نے سر اٹھا کے کنور راج کے چہرے کی طرف دیکھا۔

" کیسے ؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

" اربلا کو مجھے دیکھ۔ !"

ایک ٹھنڈی سانس میرے سینے سے نکلی۔ میرے دونوں ہونٹ بند ہو گئے۔ دونوں آنکھیں بند ہو گئیں۔ گلا رکتا ہوا معلوم ہوا۔ دل تھمتا ہوا۔ ایسا لگا جیسے ابھی ہاتھ پاؤں سے جان نکل جائے گی۔ حالانکہ کب سے مجھے اس لمحہ کا انتظار تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ میں نے اس لمحہ کا سامنا کرنے کے لئے اچھی رہیرسل کر رکھی ہے۔ وہ سب بیکار گیا۔ اب آنکھیں کیسے کھولوں

اور ہونٹوں سے کیسے بولوں، وہ سب جان لے گا۔ مجھے جلدی اپنے آپ پر قابو پاکر آنکھیں کھول کر۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ لاکر اسے ہاں کہہ دینا چاہیئے۔ مگر لمحے گزرتے گئے۔ اور میں کچھ نہ کہہ سکی۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میری کمزوری ایسی شدید درجہ کی ہے کہ قدم جہاں کے تہاں جم جائیں گے پگلی۔ تو نے ایک لمحہ کے لئے بھی کیوں سوچا تھا۔ کہ ایسا نہ ہوگا۔ اور جیسے تو نے سوچا تھا ویسے ہوگا۔ سب کچھ تیرے سامنے ہو رہا ہے۔ اور پھر بھی تو نے دوسری طرح سے سوچ لیا۔ ہر بات ہر ادا۔ ہر نگاہ۔ ہر تبسم ہر لمس کے خلاف جاکر بھی تو نے یہ کیسے سوچ لیا۔ کہ وہ تیرا ہو جائیگا۔ کبھی تیرے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ نہیں ملے۔ کبھی تیرے ہونٹوں پر اس کے ہونٹوں کی چھایا نہیں تیری۔ تیری کمر ہمیشہ اس کے لمس سے کنواری رہی۔ پھر باؤلی تو نے کیسے ایک لمحہ کے لئے ہی یوں سوچ لیا۔ ہائے! مگر وہ ایک لمحہ کیسے روشن تھا۔ جیسے سارے جسم میں چراغاں ہو گیا ہو۔ اور میں آس اور امید۔ تمنا اور سہارے کی اس سہانی روشنی میں ایک پل کے لئے بھیگتی کھڑی رہ گئی۔

پھر میں گھوم گئی اور قریب کے ایک ستون کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اب میری پیٹھ اس کی طرف تھی۔ اور میری پیٹھ اس لئے اس کی طرف تھی کہ کہیں وہ میرے آنسو نہ دیکھ لے۔

جواب بڑی بے شرمی اور بے حیائی سے میری آنکھوں سے نکل نکل کر میرے رخساروں پر بہ رہے تھے۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد مجھے ہولے سے اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کا ایک ہاتھ ستون پر گیا ـــــ اور بے دھیانی میں میرے ہاتھ کو چھونے لگا۔! چھوتے رہو ـــــ دھیرے دھیرے اسی طرح میرے دل کے دروازے پر دستک دیتے رہو۔ اسی طرح صدیاں گزر جائیں ـــــ یہ لمحہ جاوداں ہو جائے۔!

مگر وہ پھر بول اٹھا۔

"رانی جی ـــــ آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔!"

اس کے لہجہ میں خفیف سی تلخی تھی۔!

میں چپ رہی۔!

"کیا میں اس لائق نہیں ہوں۔؟"

"میں پھر بھی کچھ نہ بول سکی۔!"

وہ میرے سامنے آگیا۔!

"ارے ـــــ!" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا "آپ تو رو رہی ہیں۔؟"

میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے مسکراتے ہوئے اس

سے کہا۔

"یہ تو خوشی کے آنسو ہیں —— اس دن ہی کا تو مجھے انتظار تھا۔ کب تم مجھ سے کچھ مانگو —— !" "میں وعدہ کرتی ہوں ادملا تمہاری دلہن بنے گی۔ !"

چند لمحوں کے لئے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں میرے ہاتھوں کے اوپر رکیں —— ایک لمحہ کے لئے اس نے میرا ہاتھ زور سے دبایا —— پھر وہاں سے الگ ہو کر وہ دوسری کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔

میں کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کا چہرہ خوشی سے گلنار تھا۔ !

کنور راج کوگڑھی سے رخصت ہوئے مشکل سے پندرہ دن ہوئے ہوں گے کہ ان کی طرف سے اربلا کے لئے پیغام آگیا۔ وزیر مادھورام خود پیغام لے کے آئے تھے۔ اور دس دن تک بڑے تزک و احتشام سے انہیں گڑھی کے خاص مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا تھا ـــــ صرف شام کی چائے پر میری اور ان کی ملاقات ہوتی تھی۔ اربلا کبھی موجود رہتی تھی ـــــ وزیر مادھورام روز میرا منہ تکتے ـــــ اور روز مایوس ہوتے تھے کیونکہ میں اِدھر اُدھر کی سب باتیں کرتی تھی ـــــ مگر اس معاملہ پر گفتگو نہ کرتی تھی۔

اربلا بیچاری تو آنکھ بھی نہ ہلا سکتی تھی۔ مارے شرم کے اس کے رخسار شہابی ہو جاتے۔ کبھی کسی اندرونی خوف

سے اس قدر پیلے پڑ جاتے۔ کہ اس کا چہرہ زرد گلاب کی مانند دکھائی دینے لگتا۔

وزیر مادھورام کی آنکھوں میں ایک سوال تھا۔ مگر ارملا تو خود مجسم سوال تھی ـــــ اس کا ذہن اور اس کی روح مجھ سے بس ایک ہی جواب سننے کے منتظر تھے۔ مگر معاملہ ایسا نازک تھا۔ کہ ارملا منہ سے کچھ بول نہ سکتی تھی۔ اور وزیر مادھورام بھی پیغام دینے کے بعد یہ بدتہذیبی نہیں کر سکتے تھے۔ کہ مجھ سے فوراً جواب مانگیں ـــــ اور میں نے بظاہر ریاست کے کاموں میں اپنے آپ کو اس قدر الجھائے رکھا تھا۔ کہ گویا فرصت سے اس اہم مسئلہ پر سوچ بچار کی گھڑی نہ آئی تھی۔

اسی طرح وزیر مادھورام کو ہماری گڑھی میں ٹھہرے ہوئے دس روز گزر گئے ـــــ ہر روز ارملا کی بیتابی میری خاموشی دیکھ کر بڑھتی جاتی تھی۔ اور وہ یہ سمجھ بھی نہ سکتی تھی کہ پرابلم کیا ہے ـــــ ہاں کہہ دینے میں اب باقی کیا رکھا ہے۔ ؟ میں کیوں چپ ہوں۔ اور معاملہ کو لٹکا کیوں رہی ہوں ؟ اس کی آنکھوں میں یہ سارے سوال تھے۔ اور جب کبھی وہ چور نگاہوں سے مجھے دیکھتی تھی تو بہت سے مجرموں کی طرح یہ سوال ایک ساتھ اس کی آنکھوں سے جھانکتے دکھائی دیتے تھے۔

پندرہ دن اسی خاموشی میں گزر گئے۔ آخر جب مجھے معلوم

ہوا کہ وزیر بادھورام جیسے گھاگ اور شاطر آدمی کا پیمانہ صبر بھی لبریز ہونے کو ہے۔ اور ہر گاؤں سے کنور راج کے اس سلسلہ میں دو دو یا تین تین رقعے بھی آچکے ہیں —— تو میں نے پندرہویں دن شام کی بجائے پر ان سے کہہ دیا۔

"مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔ میں نے اچھی طرح سے غور کر لیا ہے۔ اپنے مشیروں سے صلاح بھی کر لی ہے —— سب کی متفقہ رائے یہی ہے کہ اس رشتہ سے ہر گاؤں اور زر گاؤں علاقوں کے آپس کے تعلقات بے حد خوشگوار ہو جائیں گے۔ اس لئے ہر لحاظ سے مجھے یہ رشتہ منظور ہے!"

ارملا کے چہرے پر خوشی کی گلابیاں جھلکنے لگیں ——

وزیر بادھورام کے چہرے پر اطمینان کی ایک روشنی دوڑ گئی۔ شکریے کے اظہار میں وہ بار بار کورنش بجالاتا۔

"مگر —— ایک شرط ہے!" میں بولی۔

وزیر بادھورام کورنش بجاتے بجاتے رک گئے۔

بولے۔ "کیا ہے۔"

میں نے کہا —— "دیوان جی۔ میں نے شرط کا لفظ غلط استعمال کیا ہے —— لڑکی والوں کی طرف سے کوئی شرط نہیں ہوتی۔ مگر یہاں دو ریاستوں کا معاملہ ہے۔ اور آپ جانتے ہیں۔ دیول گاؤں کے معاملہ کو لیکر آپ کے تعلق اور ہمارے

تعلقے کے تعلقات میں کیسی کشیدگی آئی ہے۔ کتنے برس تک کیسی شدید تنا تنی بھی رہی ہے۔ معاملہ ریذیڈنیٹ بہادر کے ہاتھ سے نکل کر اوپر وائسرائے تک جا پہنچا ہے۔ لاکھوں روپے ہم لگا چکے ہیں۔ لاکھوں روپے آپ لگا چکے ہیں ـــــ میں سمجھتی ہوں کہ اس نئے اس شبھ کارج سے پہلے اس تنازعے کا بھی فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔ آپ برطانوی حکومت سے اپنا کیس واپس لے لیں ـــــ دیول گاؤں خود بخود ہمارا ہو جائیگا۔ کنور جی کو بس ایک خط لکھنا ہے۔ برطانوی سرکار کو دو سطریں۔

"وزیر مادھورام حیرت سے میرا منہ تکنے لگے۔ ارملا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں ـــــ اس کا سینہ زور زور سے ہل رہا تھا۔

"کیوں ـــــ؟" میں نے پوچھا۔ "ایک گاؤں کے ادھر سے ادھر ہو لینے میں کون ایسا بڑا نقصان ہو جاتا۔ یہ ایسی کونسی بڑی شرط تھی ـــــ جس پر وزیر مادھورام حیرت سے آپ کا منہ تکتے رہے۔!"

"تم نہیں جانتے ـــــ ڈاکٹر! تم اس علاقہ میں نئے نئے آئے ہو ـــــ دیول گاؤں ہمارے علاقے اور ہر گاؤں کے علاقے اور آس پاس کے پچیس تیس تعلقوں میں سب سے بڑا دھرم استھان ہے۔ مرکزی ہند میں جینیوں کا اس سے

بڑا دھرم استھان کہیں نہیں ہے ـــــ ہر سال لاکھوں لوگ دور دراز سے یہاں یاترا کو آتے ہیں اور کئی کروڑ کا چڑھاوا چڑھتا ہے ـــــ دیکھا جائے۔ تو ہر گاؤں کے تعلقے کی آدھی آمدنی دیول گاؤں کی وجہ سے ہے ـــــ اور اگر ہر گاؤں سے دیول گاؤں کا ایک گاؤں چھن جائے ـــــ تو اس تعلقے کی ساری شان گھٹ کے آدھی ہو جائے۔!"

"مگر رانی جی ـــــ اس دیول گاؤں پر آپ کا کیا حق ہے۔؟"

"سچ پوچھو۔ تو کوئی حق نہیں ہے۔ مگر خوش قسمتی سے کہیے یا بد قسمتی سے کہیے۔ دیول گاؤں ہمارے علاقے کی سرحد پر واقع ہے ـــــ ہے تو ہر گاؤں کے علاقے میں۔ مگر چند سو گز زمین دیول گاؤں کی ہمارے حصے میں بھی آتی ہے۔ اس لئے اس پر اپنا حق جتا دیا۔ اور معاملہ کو کھینچ کھانچ کر تو یہ بھی ریاستوں کے وقار کا معاملہ بن چکا ہے۔

"تو پھر آپ نے ایسی کڑی شرط کیوں رکھی۔؟"

"کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ہر گاؤں تعلقہ کا کوئی مالک بھی دیول گاؤں کو ہمارے علاقہ میں دینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ دیول گاؤں تو کنور راج کے تعلقہ کی جان ہے۔! مجھے معلوم تھا۔ اور وزیر مادھو رام کو معلوم تھا۔

اور ارملا کو معلوم تھا۔ کہ میں نے کتنی بڑی شرط رکھ دی ہے جسے دوسری طرف والے کسی طرح قبول نہیں کر سکتے —
جیتے جی کون خودکشی کرے گا۔ اسی لئے تو حیرت سے وزیر مادھو رام اور ارملا مجھے دیکھنے کے دیکھتے رہ گئے۔
وزیر مادھورام اٹھ کر جھکے۔ جھک کر کورنش بجالائے۔ بولے۔

"میں آپ کی باتیں کنور جی تک پہنچا دوں گا۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ مجھے اپنے تعلقہ سے آئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ !"

اسی رات کو جب میں کھانے کے کمرے سے نکل کر اپنے شب خوابی کے کمرے میں جانے لگی۔ تو پیچھے سے آ کر ارملا نے میری ساڑھی کا پلّو کھینچ لیا۔ اور گھبرا کر بولی۔

"یہ کیا کیا۔ ؟ اتنی بڑی شرط لگا دی۔ ؟" جسے وہ کبھی منظور نہیں کر سکتے۔ !"

"تم تو کہتی تھیں کہ وہ دل و جان سے تمہیں چاہتے ہیں۔ !"

"ہاں — وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر دیول گاؤں ؟"

"میری بہن کے سامنے ایک گاؤں کی حیثیت کیا ہو سکتی ہے۔ ؟"

"مگر وہ کوئی گاؤں تھوڑی ہے۔ وہ تو کنور جی کی، ریاست کا دل ہے۔ !"

"تو جب وہ دل تمہارے سپرد کر چکے، تو ایک گاؤں دینے میں کیا ہرج ہے۔ ؟"

ارملا چپ چاپ میرے چہرے کی طرف تکنے لگی۔

"آپ چاہتی کیا ہیں۔ ؟"

"میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں۔" میں نے ارملا کے گال پیار سے تھپتھپا کر کہا۔ "وہ میری گوڑیا سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ ؟"

ارملا لاجواب ہو گئی۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا چہرہ کمہلا گیا تھا۔ وہ تو بالکل پھول کی طرح ہے۔ اور پھول کی طرح میں نے اسے رکھا ہے۔ اور دل و جان سے چاہتی ہوں اسے —— پندرہ دن تک میں اپنے دل کو سمجھاتی چلی آ رہی تھی۔ اور میرا خیال تھا۔ کہ آج جب میں وزیر مادھورام سے گفت گو کرنے گئی۔ تو مجھے پوری امید تھی کہ میں اپنے دل کو خوب سمجھا لیا ہے۔ اور آج میں وزیر مادھورام کو ہاں بول دوں گی۔ اور وہ غیر مشروط ہاں ہو گی —— پھر اچانک جانے کیسے یہ شرط درمیان آ گئی۔ مگر، اب کیا ہو سکتا تھا۔

دن پر دن گزرنے چلے گئے۔ ارملا کی آنکھیں ہر وقت

بھیگی سی رہنے لگیں۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے سے نظر آنے لگے ــــ وہ اپنے آپ میں گم رہنے لگی۔ گرد و پیش سے بیگانہ، اداس، محروم، ٹھنڈی سانسیں بھرنے والی ارملا۔ اکثر تھنگ کے اس پیڑ کے نیچے بیٹھی رہتی۔ جو پائیں باغ میں ہے۔ اور جہاں چاندنی راتوں میں اور شفق کی گلزار تنہائیوں میں وہ دونوں اکیلے ٹہلا کرتے تھے ــــ دس روز گزر گئے ــــ بیس روز گزر گئے۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ دوسرا مہینہ گزر گیا۔ تیسرا مہینہ گزر گیا۔ کنور راج کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ارملا اب تیزی سے سانس لیتی تھی۔ اس کی آنکھوں اور رخساروں پر ایک غیر صحت مند چمک آگئی تھی۔ اور وہ کسی صورت میں مجھ سے آنکھیں ملانے کو تیار نہ تھی۔ مگر میرے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہ تھی۔ ارملا یقیناً اسے بھول جائے گی۔ اسے بھی کنور راج کی طرح بھولنا ہوگا ــــ اپنے دل کو سخت کرلینا ہوگا۔ کیونکہ ہم لوگوں کی شادیاں محبت کی شادیاں کہاں ہوتی ہیں۔ ہم لوگ دیول گاؤں کی طرح ہیں۔ پوجے جاتے ہیں۔ اور جو پوجے جاتے ہیں۔ وہ محبت نہیں کرسکتے ــــ ارملا تمہیں بھی اپنی محبت کو قربان کرنا ہوگا ــــ اور وہیں شادی کرلی ہوگی۔ جہاں تمہاری بہن ہاں کرے گی۔ !

پھر ایک دن جب میں ارملا کے کمرے میں بیٹھی

اسے اپنی نئی کوتا سنا رہی تھی۔ ایک خادمہ مجھے یہ بتانے کیلئے آئی کہ ہر گاؤں سے وزیر مادھورام کوئی ضروری سندیسہ لے کے آئے ہیں۔ !

ارملا اس وقت اپنی سنگھار میز پر بیٹھی آنکھوں میں کاجل لگا رہی تھی۔ اور آئینے میں مجھے دیکھ کر مجھ سے کوتا سن رہی تھی —! جس وقت خادمہ نے یہ خبر آ کے دی۔ کاجل سے بھری سلائی اس کی آنکھ میں تھی۔ یکایک اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ چند لمحہ تک وہ سلائی آنکھ میں دبائے سنگھار میز کے سامنے بیٹھی رہی پھر ہولے سے سلائی نکال کر اس نے میری طرف دیکھا۔ تو مجھے اس کی آنکھیں بے حد بڑی بڑی روشن اور وسیع معلوم ہوئیں — اتنی وسیع جیسے ساری دنیا کا درد ان میں سما گیا ہو — اور مزید درد کی انہیں تلاش ہو۔ کرب کی کیسی حسرت ناک خواہش ان آنکھوں میں تھی۔ میں اٹھ کر خادمہ کے ساتھ باہر آ گئی۔ کوتا ابھی آدھی ہی سنائی تھی —!

وزیر مادھورام نے مجھے کنور راج کا خط دیا —
یہ پہلا خط تھا — جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے مجھے لکھا تھا۔ میرے لئے نہیں تھا۔ مگر لکھا تو مجھے ہی تھا۔

رانی جی —!

ایک دن میں نے آپ سے کہا تھا۔ میں ارملا کے لئے جان بھی دے سکتا ہوں — تو کیا دیول گاؤں نہیں دے سکتا — لے لیجئے۔ مگر ارملا کو مجھے دیدیجئے۔!

کنور راج

دل دھک سے رہ گیا۔ آنکھوں میں آنسو چبھنے لگے۔ میرا سر خط پر اتنا جھک گیا کہ وزیر مادھورام میرے آنسو نہ دیکھ سکے۔ میں روشنی کی کمی کا بہانہ کرتے ہوئے ایک کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ اب میری پیٹھ مادھورام کی طرف تھی۔ اور میری آنکھیں کھڑکی سے باہر ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں پر تھیں اور ان سفید بادلوں پر جو کنور راج کی طرح محبت کرنے کے لئے اپنی جگہ سے نیچے اتر کر آئے تھے۔ میں نے سوچا۔ کنور راج اب تو میرے پاس انکار کرنے کو کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ اور یہ فیصلہ بہت مشکل ہے۔ ایک عورت کے لئے جس سے وہ محبت کرے اور اسے خود ہی کسی

دوسرے کے حوالے کردے۔ !

میں نے اپنے آنسو چھپا لئے۔ میری ایسی عورتوں کو بہت سے آنسو چھپانا پڑتے ہیں ــــــ عورت کے لئے رونا بہت آسان ہے۔ قدرتی بھی ہے۔ مگر زرگاؤں کی رانی کے آنسو کوئی کیسے دیکھ سکتا ہے۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے کنور راج۔ آنسوؤں کی اک نہر سی اپنے سینے میں چھپائی ہے ۔۔ ــ یہ نہر جو آنکھوں سے براہ راست اندر ہی اندر دل کے نہال خانے میں اتر جاتی ہے۔ اور کسی کو نظر نہیں آتی ہے۔ تم کبھی میرے آنسو نہیں دیکھ سکو گے۔ کنور راج .... کوئی بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ !

میں نے یکایک کھڑکی سے مڑکر ایک چمکتی ہوئی شاداب مسکراہٹ اپنے چہرے پر لاکر وزیر مادھو رام سے کہا۔

"ان سے کہہ دینا۔ مجھے دیول گاؤں نہیں چاہیئے۔ بس اب کچھ نہیں چاہیئے ــــــ اب وہ جلد سے جلد لگن کی تیاری کرلیں۔" !

چھ ماہ بعد لگن کا سمے آگیا ـــــ ہمارے ہاں قاعدہ ہے کہ ہم بارات کو چار دن پہلے زرگاؤں کی گڑھی میں بلا لیتے ہیں۔ کیونکہ علاقہ پہاڑی ہے۔ کوئی موٹر روڈ نہیں ہے۔ طویل سفر میں بہت تھکن ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہم لگن سے چار روز پہلے بارات کو گڑھی میں مہمان ٹھہرا لیتے ہیں۔ اور اب کے تو دو پڑوسیوں میں شادی تھی۔ اس لئے دونوں عملداریوں میں بہت دھوم دھام تھی۔ دوسری ریاستوں اور تعلقوں سے بھی رشتہ دار اور دوست آگئے تھے۔ بے حد گھما گھمی تھی۔ لگن سے پہلے تین روز مہمانوں کی تواضع میں کتنی جلدی گزر گئے۔ پھر لگن کی رات آگئی۔ شادی کا منڈپ سج گیا۔

میں نے ارملا سے کہا۔ "آج میں تمہیں خود اپنے ہی ہاتھوں سے سجاؤں گی۔

ارملا خوشی سے مجھ سے لپٹ گئی۔!

میں نے اس کی سب سہیلیوں کو اس کے کمرے سے نکال دیا۔ خود اپنے ہاتھ سے اسے دلہن کا جوڑا پہنایا۔ اس کے بالوں میں پھول لگائے۔ بدن پر زیور سجائے۔ ایڑی سے چوٹی تک اس کا سنگھار کیا۔ اس وقت وہ اتنی پیاری۔ پدمنی کنچن کامنی سی لگ رہی تھی۔ کہ جب میں نے اسے آئینہ دکھایا تو وہ اپنی سندرتا سے خود ہی شرما کر میرے سینے سے لگ گئی۔ اور دھیرے دھیرے سسکیاں لینے لگی۔ بولی۔ "مجھے ڈر لگتا ہے۔! "میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی۔"

میں اسے بہلانے کی خاطر کمرے سے نکال کر باہر پائیں باغ میں لے آئی۔ باغ میں چاند تھا۔ انگوروں کے اودے خوشے تھے۔ اور دور کے پھولوں کی خوشبو تھی۔ وہ چھم چھم کرتی میرے ساتھ چلی سیدھی اس تنگ کے پیڑ کی طرف جہاں ان دونوں نے اپنی محبت کی پینگیں بڑھائی تھیں۔

جب ہم تنگ کے پیڑ کے نیچے پہنچے۔ تو چاند اوپر پتوں میں چھپ گیا۔

"اف۔ میاں کتنا اندھیرا ہے۔ چاند نظر ہی

نہیں آتا ۔ !"

اتنا کہہ کر وہ سنگ مرمر کے چبوترے پر چڑھ گئی ۔ اور ایڑیاں اٹھا اٹھا کر چاند کو دیکھنے لگی ۔ اور بچوں کی طرح تالی بجا بجا کر کہنے لگی ۔

"آہا جی ۔ میں نے چاند دیکھ لیا ۔ چاند دیکھ لیا!"

"نیچے اتر ......" میں نے اسے ڈانٹ کر کہا ۔ "چبوترے کی دیوار سے نیچے اتر آ ۔ !"

"نہیں ——" وہ شریر لہجہ میں بولی ۔ "میں انگور کا وہ گچھا توڑوں گی ۔ !"

میرے سمجھانے پر بھی وہ نہ مانی ۔ اور اسی وقت اچک اچک کے اودے انگوروں کا گچھا توڑنے کی کوشش کرنے لگی ۔ جو اس کے سر کے اوپر ۔ بہت اوپر لٹک رہا تھا ۔ جب اس کے ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچے تو وہ اچک اچک کر اسے توڑنے لگی ۔ اسی کوشش میں اس کی پیٹھ میری طرف ہو گئی ۔ اور اب کے وہ اتنے زور سے اچھلی کہ گچھا اس کے ہاتھ میں آ گیا ۔ مگر اوپر سے نیچے آتے گچھے کو پکڑ کر خوشی سے چیخ مارتے ہوئے اس کا پاؤں جو چبوترے کی دیوار سے پھسلا تو نیچے ہزاروں فٹ گہری کھڈ میں اس کا بدن گرتا چلا گیا ۔

"وہ چیخ —— میں کبھی اسے بھول نہیں سکتی ——

وہ چیخ ـــــ دور تک ایک بھیانک گونج کی طرح پہاڑوں کی تنہائی میں ڈوبتی چلی گئی۔ پھر ایک لمحہ کا مکمل سکوت۔ پھر بان گنگا کی شوریدہ لہروں کی گرج ساری فضا پر چھاگئی ....!"

نرگاؤں کی رانی چپ تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ سر تکیے سے لگا ہوا تھا۔ چہرے پر کوئی جذبہ نہ تھا۔ ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے، سینہ زور زور سے ہل رہا تھا۔

"مگر ـــــ" میں نے کہا۔ "میں نے پائیں باغ سے گزرتے ہوئے اس چبوترے کو دیکھا تھا۔ جو پائیں باغ کو کھڈ سے جدا کرتا ہے۔ وہ چبوترہ تو اتنا چوڑا ہے کہ آدمی اس پر آسانی سے بستر لگا کر پاؤں پھیلا کر سو سکتا ہے۔ اس پر سے پھسلنا بہت مشکل ہے۔!"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔!" نرگاؤں کی رانی اپنی آنکھیں کھول کر بولی۔ "وہ گری نہیں تھی۔ میں نے اسے دھکا دیا تھا۔"

پہلا سال سوگ کا گزر گیا۔ کنور راج بہادر سنگھ والئے ہرگاؤں نے مجھے شادی کا پیام دیا۔ جو میں نے نامنظور کر دیا۔ دوسرے سال پھر اس نے پیام دیا۔ میں نے پھر اسے نامنظور کر دیا۔ تیسرے سال پھر اس نے پیام بھیجا۔ میں نے اسے منظور کر لیا۔ لگن کی تاریخ طے ہو گئی۔ لگن کا وقت آن پہنچا۔ لگن ہو گیا۔ دونوں ریاستیں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں۔ دونوں ریاستوں کی پرجا کے لئے اس سے بڑا خوشی کا لمحہ ان کی زندگی میں کبھی نہ آیا تھا۔ اولاً سے شادی کے وقت بھی دونوں ریاستوں کے خزانے تو ایک ہو تے۔ مگر ریاستیں الگ الگ رہتیں۔ میری اور کنور راج بہادر کی شادی سے دونوں عملداریاں ایک ہو رہی تھیں۔ ہماری جو اولاد ہوگی وہ اب زرگاؤں اور ہرگاؤں دونوں

تعلقوں پر حکومت کرےگی۔ رعایا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔!

وہ سہاگ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ وہ بڑی ٹھنڈی اور سنجیدہ لمحہ والی سہاگ رات تھی۔ میں دلہن کا لباس ضرور پہنے ہوئے تھی۔ مگر اندر سے دلہن محسوس نہ کرتی تھی۔ وہ دولہا بن کر آئے تھے۔ مگر کمرے کے اندر آکر میری مسہری کے قریب آنے کے بجائے دیوار سے لگے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ اور قریب کی دیوار پر لگی ہوئی ارملا کی تصویر دیکھنے لگے تھے۔!

"یہ تصویر یہاں نہ ہونی چاہیئے!" وہ بڑے سنجیدہ لہجہ میں بولے۔ ان کے چہرے پر کسی طرح کی گھبراہٹ نہ تھی۔!

"کیوں۔؟ ارملا میری بہن تھی۔ میری چہیتی۔ میرے ماں باپ کی آخری نشانی۔!"

"میرا اعتاب ہے۔ اس تصویر کو کہیں اور لگا لو۔ یہاں خواب گاہ میں نہیں۔" وہ کامل سکون سے بولے۔ پھر اٹھ کر وہ خود ہی تصویر کے قریب گئے۔ ایک تپائی پر چڑھ کر انہوں نے تصویر اتار لی اور اسے لے کر باہر کے ڈرائنگ روم میں جاکر اسے ٹانگ دیا۔ پھر اندر آکر صوفے پر بیٹھ گئے۔ اور جوتے کھول کر جرابیں اتارنے لگے۔ جرابیں اتارتے اتارتے بولے

"ایک بات پوچھوں۔؟"

"پوچھو۔!"

"تم اگر چاہتیں تو اس روز جنگل میں مجھے چیتے سے لڑنے سے بچا سکتی تھیں۔ مگر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا۔؟"

"میں دوسرے کے شکار میں دخل نہیں دیتی۔" میں نے دلہن کی مسہری پر لیٹے لیٹے جواب دیا۔

"اور اگر چیتا۔ مجھ پر حاوی ہو جاتا۔ تو۔؟"

"تو میں اسے ہلاک کر دیتی۔ مگر پھر زندگی بھر تم سے بات نہیں کرتی۔!"

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ مگر وہیں صوفے پر بیٹھے رہے۔ یہ میری مسہری پر کیوں نہیں آتے۔؟ جرابوں سے کیوں کھیل رہے ہیں میرے بدن میں یہ سرد سی لہر کیسے دوڑ رہی ہے۔ جیسے کوئی گلیشیئر میرے دل کی ڈھلوان پر اتر تا جا رہا ہو۔ میرا جسم سن ہو رہا ہے۔ سہاگ رات کیا ایسی ہی ٹھنڈی ہوتی ہے۔؟

جرابیں تہہ کر کے انہوں نے جوتے میں رکھ دیں۔ پھر اٹھے۔ میں نے سمجھا میری مسہری کی طرف بڑھیں گے۔ مگر نہیں۔ وہ تو وہیں کھڑے ہو کر اپنی شیروانی اتارنے لگے۔ شیروانی اتار کر پھر صوفے پر بیٹھ گئے۔ اور اپنی قمیص کے طلائی بٹن کھولتے ہوئے بولے ......"میں نے ایک بار ارملا سے کہا تھا۔ تم بہت کمزور لڑکی ہو۔ مگر تمہاری بہن بہت مضبوط

ہے۔ خوب صورت بھی ہے۔ مگر مضبوط زیادہ ہے۔ اتنی مضبوط کہ لگتا ہے۔ کہ یہ عورت شاید عورت ہی نہیں ہے۔!"

میں چند لمحے چپ رہی۔ خاموشی سے انہیں تکتی رہی۔ اب انہوں نے قمیص اتار دی تھی۔ اور اپنے چوڑے چکلے سینے کے بالوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر رہے تھے۔

میں نے ڈانٹ کر کہا۔

"ادھر آؤ۔!"

وہ صوفے سے اٹھے اور میری مسہری کے قریب آ کے کھڑے ہو گئے۔ میں اپنے دونوں بازوؤں کو ان کے گلے میں حائل کر کے انہیں اپنی طرف جھکاتے ہوئے بولی۔ "ادھر آؤ تاکہ میں بتاؤں کہ میں عورت بھی ہو سکتی ہوں۔!"

زرگاؤں کی رانی کا چہرہ اب نقاب نہ رہا تھا۔ وہ ایک عورت کا چہرہ تھا۔ جو سہاگ رات کی میٹھی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ ایک نرم و نازک عجیب شرمائی ہوئی یادوں کا چہرہ تھا۔ عجیب چہرہ ہے۔ جب چاہتا ہے اپنے اوپر مردانہ پن طاری کر لیتا ہے۔ جب چاہتا ہے نسوانیت کی نازک تصویر بن جاتا ہے۔ ایسا عجیب و غریب چہرہ تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ زرگاؤں کی رانی کے بڈھے چہرے پر اس وقت شادمانی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

میں چپ رہا۔ اس پرمسرت لمحہ کی یادوں میں خلل نہ ڈالنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے یہی ایک لمحہ ہو۔ اس عورت کی زندگی میں یہ لمحہ جتنا بھی طویل ہو جائے۔ جتنا بھی کھنچ جائے اچھا ہے۔!

یکایک ان شادماں لہروں کی ریل پیل چہرے سے غائب ہوگئی۔ اب پھر وہ بڈھا چہرہ ایک نقاب تھا۔ ایک عجیب تاسف انگیز دردناک مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آ گئی وہ دھیرے سے بولی۔

"ایسی رات تو پھر کبھی آئی نہیں میری زندگی میں۔ ایسا لگا جیسے میں نے وہ سب پا لیا۔ جسے میں نے کھو دیا تھا۔ جسکی تمنا میں نے زندگی بھر کی تھی۔ جس کے لئے میں نے اتنی بڑی قربانی دی تھی۔ ایسا لگا جیسے وہ واقعی مجھ سے اور صرف مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں۔ جیسے ارملا کو وہ اب بھول گئے ہیں۔ جیسے اب ان کے ذہن پر ان کے دل و دماغ پر میں ہی چھا رہی ہوں۔

رات کے تیسرے پہر میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایسا لگا وہ بے خبر میری باہوں میں سو رہے ہیں۔ میں آنکھوں کو کھول کر غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ چادر ہٹا کر ان کا جسم دیکھنے لگی۔ جہاں جہاں چیتے کے پنجوں کے نشان رہ گئے تھے۔ وہاں اپنی انگلیاں دھیرے دھیرے پھیرنے لگی۔

ایک نشان کندھے پر تھا - ایک سینے پر - ایک دل کے قریب یہاں - کاش میری انگلیاں مرہم بن جائیں اور ہر زخم کا نشان مٹا دیں - !

یکایک وہ چونک کر جاگے - اور اپنی پسلی کے نشان پر میری انگلیاں چلتے ہوئے محسوس کر کے بولے -

"کیا میرے دل کے داغ ڈھونڈ رہی ہو - ؟"

"میں دھک سے رہ گئی - میرا گلا بھر آیا - جی چاہا - انہیں دھکا دیکر اپنے سے الگ کر دوں اور بھاگ کر کسی دوسرے کمرے میں جا کر چھپ کر رو دوں ـــــــ مگر انہوں نے مجھے اپنی باہوں میں کس لیا تھا - اور اس طرح پیار کر رہے تھے جیسے یہ فقرہ انہوں نے کسی گہری اہمیت سے نہیں کہا تھا - محض ایک سطحی چھچھلتی ہوئی حرکت سے ایسا کیا تھا ـــــــ اتنا پیار کیا - اتنا پیار کیا کہ اس فقرے کا سارا زہر نکل گیا ـــــــ بس ایک ہلکی سی چبھن کہیں رہ گئی - "

چند دنوں کے بعد ہی ہم پوجا کے لئے دلیول گاؤں گئے - جہاں ہمارے علاقے کے نو بیاہتا جوڑے شادی شدہ زندگی میں خیر و برکت حاصل کر لینے کے لئے جاتے ہیں - یہاں تین اونچے اونچے پہاڑی ٹیلے، جنکے گرد برہمن ندی چکر کاٹتی ہوئی گھومتی ہے - اس ندی نے ان تینوں ٹیلوں کو ایک خوبصورت

جزیرے میں تبدیل کر دیا ہے۔ مندروں تک پہنچنے کے لئے برہمن ندی کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ ہر ٹیلے پر دو دو مندر بنے ہوئے ہیں۔ خوبصورت مدور مندر سرخ پتھر کے بنے ہوئے۔ ٹیلے کی چوٹی سے اٹھتے ہوئے ــــــ ایسا لگتا ہے۔ جیسے کسی دلہن کے مہندی بھرے ہاتھ مصروف دعا ہوں۔!

برہمن ندی کو کئی جگہ سے پیدل چل کے عبور کیا جاسکتا ہے۔ کہیں جگہ تیر کر بھی۔ مگر صرف ایک جگہ اس کا پاٹ اتنا بڑا ہے۔ کہ اسے کشتی سے ہی عبور کیا جا سکتا ہے۔ یہاں شاہی بجرے میں ہم سوار ہوئے۔ اور بجرا دھیرے دھیرے دوسرے کنارے کی طرف مڑنے لگا۔ جہاں پہلے دو مندروں کو جانے والی اونچی سیڑھیوں کا گھاٹ شروع ہوتا ہے۔

ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ فضا میں ایک عجیب سا سکون تھا۔ دھیرے دھیرے بجرا بہہ رہا تھا۔ دور اوپر مندروں سے آتی ہوئی چاندی کے گھنٹوں کی سریلی صدا اور مندروں سے اوپر بادل۔ لوبان کے دھوئیں کی طرح فضا میں اٹھتے ہوئے۔ اور عورتیں رنگا رنگ ساڑھیوں میں ملبوس بچے سنبھالتی ہوئیں اونچی لمبی پہاڑی چٹانوں کو کاٹ کر بنائی گئی۔ ایک سو آٹھ سیڑھیوں پہ دھیرے دھیرے اوپر جاتی ہوئیں۔ اوپر سے نیچے اترتی ہوئیں ــــــ انسان کی یہ کاوش جو

آسمان کی طرف جاتی ہے۔ اور وہاں سے کچھ لیکر واپس دھرتی کی طرف مڑتی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے یہ۔ اس کا واپس دھرتی کی طرف مڑنا۔ جی چاہتا ہے کہ اگر ایک بار آسمان کی طرف جاؤں تو واپس نہ آؤں ——— چھلانگ مار کر اور اوپر کہیں چلی جاؤں مگر ایسا ہو نہیں سکتا ——— واپس دھرتی کی طرف آنا پڑتا ہے کنور کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ اور ہاتھ بجلی کے تار دل کے آخری ڈوسرے ہوتے ہیں۔ اور اب ہم دونوں کے درمیان بجلی کی ایک رو چل پڑی ہے ——— مدھم مدھم اور سُست وولٹیج کی کمی ہے۔ مگر رو چل رہی ہے۔ میں ان سے پوچھتی ہوں۔

"اچھا لگتا ہے۔؟"

"بہت اچھا۔!"

میں چپ رہتی ہوں۔ اب وہ مجھ سے پوچھتے ہیں۔

"جب میں نے تمہیں دلیول گاؤں دیا تھا۔ تم نے لیا کیوں نہیں۔؟"

میں نے ان کے شانے پر سر رکھ کے کہا۔ "اب تو میں نے اس سے بھی بڑی چیز لے لی ہے۔!"

ہاتھ کی رو اکدم رک سی گئی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر دھیرے دھیرے چلنے لگی۔ اکدن اس بجلی کو میں تیز کر لوں گی۔

وہ اسی رفتار سے دوڑ گئی جس رفتار سے وہ میری ہتیلی میں دوڑ تی ہے۔!"

میں نے پوچھا۔۔۔ "بھلا اس ندی کو برہن کیوں کہتے ہیں۔؟ عجیب سا نام ہے۔۔۔ برہنا۔!"

"برہنا۔۔۔ اس لئے کہ یہ ندی کبھی مندر کے دوار پر نہیں پہنچ سکتی، ہمیشہ نیچے قدموں میں چکر کھاتی رہتی ہے۔"

وہ کسی قدر اداسی سے بولے۔ اور دور اوپر مندروں کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر یکایک پلٹ کر انہوں نے میرے چہرے کو اپنی ہتیلیوں میں لے لیا۔۔۔ اور غور سے میری سبز آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"تمہاری آنکھوں کے جنگل کتنے گھنیرے ہیں۔ کہیں سے اندر جانے کا راستہ نہیں ملتا۔!"

میں نے ان کے سینے سے لگ کر سسک کر کہا۔۔۔

"تم آؤ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس جنگل میں صرف ایک آدمی کے آنے کا راستہ ہے۔ اور اس کے لئے بھی صرف آنے کا راستہ ہے۔ باہر جانے کا نہیں ہے۔!"

وہ مسکرا دیئے۔ بولے۔ "بہت مضبوط ہو۔ بالکل چٹان ہو۔ تم پر تو ایک دیول بنانا چاہیئے۔!"

"وہ تو بنا لیا میں نے۔ اور ایک تاج کی طرح اپنے

سر پر سجا لیا ــــ کیا وہ مندر تمہیں دکھائی نہیں دیتا ہے۔؟"

لاجواب ہو کر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا ــــ اور آگے چلے گئے۔ اور بجرے کی ریلنگ سے لگ کر کھڑے ہو گئے اور نیچے برہمن کے نیلے برفیلے خنک پانیوں میں دیکھنے لگے۔

میں پھر ان کے قریب چلی گئی ــــ اور ان کی طرح ریلنگ سے لگ کر نیچے دیکھنے لگی۔ پھر مجھے کچھ خیال آیا۔ میں نے اپنی چھنگلیا سے ہیرے کی ایک انگوٹھی نکالی۔ اور اسے بجرے سے نیچے ندی میں گرا دیا۔

"یہ کیوں۔؟"

"شادی شدہ زندگی کی خوشحالی کے لئے......!"

وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ بجرا گھاٹ سے لگنے لگا۔ زائرین کا شور بڑھ گیا۔ روز کی طرح کی رونق تھی۔ مگر خلاف معمول کچھ نہ تھا۔ ہم نے کہہ رکھا تھا کہ ہماری آمد کو مشتہر نہ کیا جائے۔!

ہولے ہولے عام یاتریوں کی طرح ہم پہاڑ کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ کبھی ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہوتا کبھی ان کا ہاتھ میری کمر میں۔ اس طرح تو یہ سیڑھیاں اگر ساری عمر اوپر چڑھتی جائیں تو میں ساری عمر ان پر چل سکتی ہوں۔!

وہ میرے ساتھ ساتھ لگے لگے مجھے سہارا دیکر چل رہے

تھے۔ حالانکہ مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر ان کی ضرورت تو تھی۔ اس لیے تھوڑے وقفوں کے بعد میں بے سہارا سی ایسی ہو جاتی گویا ان کی مدد کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی ہوں۔ وہ رک جاتے اور ان کا ہاتھ مضبوطی سے میری کمر میں آجاتا ——

اسے دیول —— تھوڑے سے اور اونچے ہو جاؤ —— کبھی نہ تم تک پہنچ سکیں ہم ......!

یکایک ان کا ہاتھ میری کمر سے الگ ہو گیا۔ بجلی کی رو کٹ گئی۔ میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا —— وہ مجھ سے الگ ہو کر کھڑے تھے۔ اور اوپر دیکھ رہے تھے —— بہت اوپر جہاں مندر کے دوار سے ایک عورت نکل رہی تھی —— سفید ساڑی میں ملبوس۔ پلّو سے اپنے سر کو ڈھانپے۔ چہرے کو چھپائے اک شناسا چال سے چلتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا —— مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟ یہ ارملا کیسے ہو سکتی ہے۔؟

مگر وہی چال تھی۔ وہی قد تھا۔ وہی ہٹ۔ وہی رخ کی تجلی تھی جو انھی دور سے ہمیں دیکھنے کو ملتی تھی۔ مگر یہ ارملا کیسے ہو سکتی ہے۔؟

میں تو وہیں جس سیڑھی پر کھڑی تھی۔ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی —— مگر وہ جیسے کسی خواب کو اپنے قریب آتے اور نیچے

اترتے دیکھ کر اس کی طرف مجھ سے بے خبر دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کی طرف جانے لگے۔ یہ بھی نہ دیکھتے ہوئے کہ ان کے قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔ اوپر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ پاؤں سے نہیں۔ اس ایک نگاہ کی ڈوری سے جو نیچے اترنے والی عورت کے نیم مستور رخ پر پڑ رہی تھی۔ وہ اوپر ہی اوپر چڑھتے گئے۔ اور شاید ان کے دل کی دھڑکن اور بے تابی کے ساتھ ساتھ ان کے قدم بھی تیز ہوتے گئے۔

جب وہ اس عورت کے قریب پہنچے۔ تو ہوا کے ایک تیز جھونکے سے یکایک اس عورت کے سر سے پلو سرک گیا۔ اور اس کا پورا چہرہ ان کی اور میری آنکھوں میں آگیا۔ اور یکایک میں نے اطمینان کی ایک لمبی سانس بھری۔ اور میرے اعصاب جو اب تک ان چند لمحوں میں ایک اذیت ناک کرب سے تڑپنے لگے تھے۔ یکایک پھول کی طرح ہلکے ہو گئے —— یہ چہرہ تو کسی دوسری عورت کا چہرہ تھا —— وہ دور کی مشابہت اب غائب ہو چکی تھی —— یہ بھی کوئی امیر اور رئیس عورت تھی۔ جو اپنی جوانی میں بے حد خوبصورت رہی ہوگی —— مگر اب تو یہ چہرہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت کا چہرہ تھا —— وہ میرے قریب سے آنکھیں جھکائے نگاہیں سیڑھیوں کے تھپڑوں پر جمائے نیچے اتر گئی۔ اور میں اوپر چڑھنے لگی۔ اوپر چڑھتے چڑھتے تیز

تیز قدموں سے میں نے کنور جی کو جا لیا ـــــ اور جاتے ہی ان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

انہوں نے مجھ سے آنکھیں چرا کر اوپر مندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چند لمحوں کے لئے میں حیران رہ گیا۔ اس عورت کو دیکھ کر۔ چاچی جی یہاں کیسے آ گئیں .... وہ تو دلّی میں ہیں۔ اور بیمار ہیں........ چاچی جی ...."

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگے ـــــ میں چپ رہی ـــــ! اس لمحہ چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔

دیول گاؤں سے واپس آکر ہم لوگ ہنی موں منانے کے لئے نینی تال چلے گئے ــــ حالانکہ ہمارے علاقہ میں بھی کئی پر فضا پہاڑی مقام ہیں۔ مگر میں ان جانے پہچانے علاقوں سے کہیں دور جانا چاہتی تھی ــــ جہاں کی فضا ہم دونوں کے لئے اجنبی ہو۔ جہاں کے ماحول میں ان کو ارملا کی یاد نہ ستائے۔ یا اس قدر تو نہ ستائے جس قدر یہاں اس کی یادوں میں رچے بسے ماحول میں ستاتی ہے۔

چائنا پیک کی طرف جاتے ہوئے دیودار وں سے گھرے ہوئے راجہ صاحب رام پور کا ایک کاٹج نما محل ہمیں رہنے کو مل گیا۔ جس کے چھتے ہوئے برآمدے کی چوبی محرابوں سے لپٹی ہوئی بیلوں میں زرد گلاب کھلے ہوئے تھے۔ جہاں صبح بیٹھ کر

ہم ناشتہ کرتے تھے۔ جہاں سے نیچے نینی تال کی خوبصورت وادی کا سارا منظر دکھائی دیتا تھا ——— چاروں طرف سے مسدود گھاٹیوں نے نیچے اتر کر ایک چھوٹی سی جھیل کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ اور سر بفلک گھاٹیوں کے سرسبز گھنے جنگلوں میں خوشنما کوٹھیاں شریر بچوں کی طرح ادھر ادھر چھپی ہوئی تھیں ——— کبھی بادل لہرا کر جو نیچے اتر آتے۔ تو زمین ہماری نگاہوں سے کٹ جاتی۔ اور ایسا لگتا جیسے ہماری کالج ہوا کے دوش پر یا الف لیلیٰ کے کسی جن کی ہتھیلی پر اڑ رہی ہے۔ اور عجیب عجیب سی کوتائیں میرے دماغ میں آنے لگتیں۔

وہ کہتے ——— "مجھے حیرت ہے تمہارے ایسی چٹان کی طرح مضبوط عورت شاعری کیسے کر لیتی ہے۔؟"

میں کہتی ——— "مگر چٹان میں دراڑیں بھی تو ہوتی ہیں۔"

رات کو اطلسی صوفوں والے ڈرائنگ روم میں سونے سے پہلے وہ مجھ سے میری کوتا سنا کرتے تھے ——— ڈرائینگ روم کی بتیاں گل کر دی جاتیں۔ صرف نیلے بلور کا ایک چھوٹا سا فانوس میرے سر کے اوپر روشن رہتا۔ اس کی ہلکی روشنی چھن چھن کر میرے لباس پر پڑتی رہتی۔ اور میری کوتا کے کاغذ پر ——— اور میں کوتائیں کھوئی ہوئی انہیں سناتی رہتی ——— اور وہ میرے بائیں طرف میرے صوفے سے ہٹ کر اپنی کرسی کو ذرا کھسکا کر اس

طرح بیٹھتے تھے۔ جہاں سے میں انہیں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ صرف وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ اور وہ بھی میرا دایاں رخ ۔۔ اور رخ کا بھی ایک حصہ ـــــ یعنی کالے بالوں کی لہراتی ہوئی ایک زلف اور کان کی ایک لو۔ زلفیں گرہ گیر۔ اور دائیں رخسار کا ایک حصہ۔ بس اتنا ہی انہیں نظر آتا تھا۔ اور مجھے جب دیکھنا ہوتا...... تو میں پلٹ کر ہی انہیں دیکھ سکتی تھی۔

"کوتا سننے کا یہ کیا طریقہ ہے۔" میں ان سے کہتی۔ "سامنے آکے بیٹھو!"

"سامنے آکے بیٹھوں گا۔ تو چہرے میں کھو جاؤں گا۔" وہ مسکرا کر کہتے ـــــ "مجھے یہیں سے سننا اچھا لگتا ہے ـــ آواز بھی صاف آتی ہے۔ اور یہ نیلی روشنی جو چھن کر تمہارے لباس پر اتر آتی ہے۔ اس سے تم آسمان کی پری معلوم ہوتی ہو۔!"

ایسی تعریف تو انہوں نے کبھی نہیں کی تھی۔ اور یہ اوپری تعریف بھی نہ تھی ـــــ آواز میں گہری شدت تھی اور ایک غم آشنا خلوص، جو مجھے چھوئے بغیر نہ رہا۔

اب میں ہر روز اسی طرح بیٹھتی تھی۔ جہاں مجھے وہ بیٹھنے کے لئے کہتے تھے۔ اور وہی کوتائیں سناتی تھی۔ جو انہیں پسند تھیں۔ وہ اسی جگہ بیٹھتے تھے۔ جو انہیں اس درجہ پسند تھی ـــــ کوتا سنتے سنتے وہ کھوئے ہوئے انداز میں پیچھے سے چل کر میرے قریب

آجاتے۔ مجھے بے اختیار اپنے صوفے سے اٹھا کر اپنی باہوں میں سمیٹ لیتے اور خواب گاہ کی طرف چلنے لگتے ـــــ اس وقت میں ان کے سینے کی پرشور دھڑکن صاف سن سکتی تھی۔ میری کوتا جیسے ان پر جادو کر دیتی تھی ـــــ اور وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتے تھے ـــــ اور مجھے سینے سے لپٹائے بہت بہت پیار کرتے تھے۔ میں مدہوش سی ہو جاتی تھی۔!

میں کوتا سناتے سناتے مڑ کر نہیں دیکھتی تھی۔ کیونکہ انہوں نے منع کر رکھا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ خود جگہ جگہ داد دیتے جاتے تھے۔ جیسے مجھے آسرا دے رہے ہوں۔ تم پڑھو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں ـــــ اور ان کی وہ بھاری مردانہ آواز جیسے میری کمر میں ہاتھ دے کر اسے اوپر کوتا کی سیڑھیوں پر چڑھا رہی ہو۔

ایک دن ایسا لگا مجھے جیسے وہ بہت عرصہ سے خاموش ہیں۔ میری کوتا بھی طویل تھی۔ میں نے محسوس کیا۔ جیسے وہ ہنکارا نہیں دے رہے ہیں۔ ان کی طویل خاموشی سے پریشان ہو کر مجھے خیال ہوا شاید وہ کوتا سنتے سنتے سو گئے ہیں۔ یا بور ہو رہے ہیں ـــــ میں نے ذرا سا پلٹ کر جو انہیں دیکھا ـــــ تو وہ وہیں بیٹھے تھے۔ اسی صوفے پر اسی انداز میں۔ آنکھیں کھلی۔ مگر میرے رخ میں ڈوبی ہوئیں۔ کھوئی ہوئیں۔ ان کا پورا

وجود اس وقت میری آواز کی دسترس سے بہت دور کہیں جا چکا تھا۔

میں نے جلدی سے اپنا پورا چہرہ ان کی طرف پلٹ دیا۔ اور کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ان کی جامد و ساکت ٹھہری، ڈوبی پتلیوں میں ہلچل سی پیدا ہوئی —— یکایک وہ کھوئی ہوئی زیر آب خوابوں میں کسی کو تلاش کرنے والی نگاہیں ابھر کر سطح پر آگئیں۔ وہ چونک گئے۔ اور حیرت سے اس طرح میری طرف دیکھنے لگے جیسے اپنے سامنے کسی اجنبی کو دیکھ رہے ہوں —— پہلی بار —!

"کہاں تھے —؟" میں نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

"کونا نہیں سن رہے ہو۔ —؟"

"ڈارلنگ —!" وہ اپنی پرکشش مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے بولے —— "میں تمہیں دیکھ رہا ہوں ...... تمہارا یہ رخ مجھے بہت پسند ہے .... بہت ہی پسند ہے۔ ......!"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھے چومنے لگے۔

ایک روز میں نے ایک تجربہ کیا۔ اس روز میں کاٹج میں اکیلی تھی۔ وہ نیچے پارٹ تلک میں پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے کسی انگریز افسر سے ملنے چلے گئے تھے —— بادل گھر کر آئے تھے۔ چاروں طرف ایک تھوڑا سا اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس وقت یکایک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں گھسکر

ساری کھڑکیاں بند کر دیں — سارے پردے گرا دیئے۔ اور جب ڈرائینگ روم میں تقریباً رات کا سا سماں ہوگیا۔ تو اپنے سر کے اوپر صوفے کے پیچھے وہی نیلے کانچ والا فانوس روشن کیا۔ پھر میں نے اپنی پرانی بوڑھی کھلائی امن چین کو ڈرائینگ روم میں بلایا۔ اور اسے اسی جگہ اسی زاویئے پر اسی کرسی پر بٹھایا۔ جہاں کوتا سنتے وقت کنور جی بیٹھتے تھے۔ امن چین سن لے — کان کھول کے دھیان دے کے میری بات سن۔ میں وہاں بیٹھتی ہوں۔ اس صوفے پر۔ تجھ سے تقریباً پیٹھ کر کے۔ اور کوتا پڑھتی ہوں۔ اور تو یہاں بیٹھ کے مجھے دیکھ — اور مجھے بتا کہ کیا میں واقعی اس جگہ سے بہت سندر جان پڑتی ہوں۔ ؟"

امن چین کو میری عجیب وغریب خواہش پر بڑا تعجب ہوا۔ اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "آپ تو ہر طرح سے سندر لگتی ہیں۔ مہارانی جی! میں نے کہا۔ امن چین زیادہ بک بک نہ کر۔ بس وہیں بیٹھ جا۔ جہاں میں تمہیں بٹھاتی ہوں — اور میں اس صوفے پر بیٹھ کر کوتا پڑھتی ہوں — اور تیری طرف پیٹھ کر کے بیٹھونگی۔ کہ تجھے یہ زلف اور یہ کان کی لو۔ اور چہرے کا بس اتنا ہی حصہ دائیں طرف سے نظر آئیگا۔ پھر جب میں کوتا پڑھنے لگونگی تو دیکھ کر بتائیو۔ !"

امن چین کنور جی کی جگہ بیٹھ گئی۔ اسی زاویئے سے۔

میں اپنے صوفے پر بیٹھی ـــــ میں نے اپنے سر کے اوپر نیلے بلّور والے فانوس کو صحیح جگہ پر رکھا ۔ اور کاغذ ہاتھ میں لے کے اپنے زاویے پر بیٹھ گئی ۔ اور اس سے پوچھا ۔

"امن چین میں ٹھیک بیٹھی ہوں کیا ۔ ؟"

"نہیں ـــــ !" امن چین بولی ۔ "تھوڑا سا ادھر گھوم جاؤ ۔ !"

"اب ـــ ؟"

"تھوڑا اور ۔ ...... !"

"اب ۔ ؟"

"ہاں ـــ بس ۔ اب ٹھیک ہے ۔ !"

میں نے کاغذ کھول کر سر کو تھوڑا سا جھکا کر بالکل اسی زاویے میں کوتا پڑھنی شروع کی جس زاویے میں کنور جی مجھے دیکھنے کے عادی تھے ۔ !

یکایک امن چین نے ہائے کہہ کر دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیے ۔

میں تیزی سے پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگی ۔ "کیا بات ہے ۔ ؟" میں نے پوچھا ۔ !

"ہائے ! بالکل اربلا لگتی ہو ـــــ !" امن چین ہانپتی ہوئی بولی ۔

اس رات میں نے کنور جی کو کوتا نہیں سنائی۔ کھانے کی میز سے اٹھتے ہی میں نے سر درد کا بہانہ کر لیا۔ اور جا کے سیدھے اپنے بستر پر پڑ گئی ــــ کنور جی کافی روم سے کافی پیچھے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی باہوں میں لینا چاہا۔ مگر میں نے انکار کر دیا ــــ اور لحاف اچھی طرح اپنے چاروں طرف لپیٹ کر پڑ گئی۔

کنور جی کچھ دیر تک تو جاگتے رہے۔ کروٹ بدلتے رہے۔ لیمپ جلا کر رنگین تصویروں والے رسالے دیکھتے رہے۔ پھر بتی بجھا کے سو گئے۔!

کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ آج ہوا تیز تھی۔ بادل کی گرج بھی تھی۔ اور کبھی کبھی دریچوں پر تڑ تڑ پڑنے والی تیز بارش کی

بوچھاڑ۔ یوں لگتی ہے۔ جیسے کوئی میرے رخسار پر تڑاتڑ طمانچے مار رہا ہو۔

اب مجھے کیا معلوم تھا کہ ارملا کو مار کر بھی میں خود اپنے اندر ارملا کو زندہ رکھوں گی ـــــ خود میری مرضی کے خلاف میری ہی ہستی میں کہیں نہ کہیں چھپ کر وہ زندہ رہے گی۔ کبھی میرے رخ کے کسی زاویئے میں۔ کبھی میری چال کے کسی ادا میں۔ کبھی میری آواز کے کسی سر میں۔ یعنی کوئی مجھ میں کسی اور کو دیکھے گا۔ اور میری آواز کو سن کر کسی دوسری آواز کو یاد کریگا۔ اور مجھے اپنی باہوں میں لے کر کسی اور سے پیار کریگا۔ ایسے خوفناک جنم کا تو میں نے کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔ میں نے سمجھا تھا میں نے دیول گاؤں کو پالیا۔ آج معلوم ہوا کہ دیول مجھ سے آج بھی اتنی ہی دور ہے۔ جتنا پہلے دن تھا۔ اور میری حالت تو اس بہن ندی کی سی تھی۔ جو دیول سے بہت دور اس کے قدموں کے گرد چکر کاٹتی ہے۔ اور سر ٹیک کر وہیں رہ جاتی ہے۔

اچھا۔ اگر یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ کنور راج۔ تم میری باہوں میں عاشق کی طرح نہیں آؤ گے تو میں تمہیں ان باہوں میں قیدی بنا کے رکھوں گی۔ مگر تم میرے جیتے جی ـــــ میری باہوں کے حصار سے کبھی آزاد نہ ہو سکو گے ـــــ میرا ابھی یہی فیصلہ ہے ـــــ ایک دن قیدی بھی جیل کی دیواروں سے مانوس

ہو جاتا ہے۔ ایک دن تم بھی مجھ سے مانوس ہو جاؤ گے — اور جب تمہیں میری عادت پڑ جائے گی۔ تو شاید محبت بھی ہو جائے گی۔ کنور راج میں بہت مضبوط عورت ہوں — جو طمانچے تم میرے رخسار پہ مار رہے ہو، ان کے باوجود میں کبھی روؤں گی نہیں۔ کنور راج میں تمہیں جیت کے رہوں گی۔!"

اتنا کہہ کر رانی جی چپ ہو گئیں — کمرے میں ایک طویل سناٹا چھا گیا۔

ہوتی جو ایک دوسرے کو محبت کے فریب سے جاتی ہے۔ تو ممکن ہے۔ ان کے دل میں شبہے کا شائبہ سا گزرا ہوتا ـــــ مگر یہاں شبہ کرنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔

"اور دنیا ـــ ؟" میں نے پوچھا۔

دنیا بھی کیسے شبہ کر سکتی تھی۔ میں بڑی بہن تھی۔ راج پاٹ کی جائز حقدار ـــ وہ میری چھوٹی بہن تھی۔ قاعدے سے اسے میرے خلاف سازش کرنی چاہیئے تھی۔ اس لئے دنیا کی نظروں میں میں قطعاً معصوم تھی۔ پھر میں اسے کس قدر چاہتی تھی۔ یہ بھی دنیا جانتی تھی۔ کس طرح وہ میرے رستے میں حائل تھی اس کا دنیا کو کیا خود ارملا کو بھی کوئی اندازہ نہ تھا۔ اور اسے اپنے راستہ سے ہٹا دینے کا میں نے کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا۔ ! اسے دھکا دینے سے پہلے میں خود نہیں جانتی تھی۔ کہ میں ایسا کروں گی ـــ وہ تو ایک لمحہ کی اضطراری حرکت تھی۔ ......!

ہم چھ مہینے ہرگاؤں میں رہتے تھے ـــ چھ مہینے زرگاؤں میں مگر ہم کہیں بھی ہوں۔ ارملا کی برسی منانے کے لئے ہم ضرور زرگاؤں کی گڑھی میں آجاتے اور تنگ کے اسی پرانے پیڑ کے نیچے چند گھنٹے اس کی یاد میں صرف کرتے۔ !"

"کچھ عجیب سا نہیں لگتا تھا۔ ؟" میں نے پوچھا۔

"شروع شروع میں لگتا تھا۔ ڈرتی تھی۔ اپنی کسی حرکت سے راز افشانہ کر دوں۔ مگر میں آہنی ارادے والی عورت ہوں میں نہ جھک سکتی ہوں۔ نہ ٹوٹ سکتی ہوں۔ مجھے اپنی طبیعت پر مکمل قابو ہے۔ اور پھر سال میں چند گھنٹے ہی تو ہوتے تھے ــــ ورنہ ہم دونوں اس پائیں باغ میں جانے سے احتراز کرتے تھے۔ !"

"ارملا آپ کو کبھی خواب میں آئی ۔ ؟"

"نہیں ــ آج تک نہیں آئی۔" رانی جی قطعیت سے بولیں۔ "مجھے خواب نہیں آتے ۔ !"

"عجیب بات ہے۔ !"

"ہاں ہے تو عجیب۔" وہ بولی۔ "مگر سچ تو یہی ہے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ کوئی خواب نہیں دیکھا۔ صاف گہری نیند آتی ہے۔ !"

"رات کی تاریکی میں اس کمرے سونے اور اکیلے پن میں آپ نے کبھی یوں محسوس کیا کہ جیسے ارملا آپ کے پیچھے کھڑی ہے۔ گہری گہری سانسیں لے رہی ہے۔ یا تاریکی میں اپنی جلتی ہوئی آنکھوں سے آپ کو گھور رہی ہے۔ ؟"

اس نے آہستہ سے انکار کر دیا۔ اور دھیرے سے مسکرا کر کہنے لگی ــــ "ڈاکٹر گھوش میں وہمی عورت نہیں

ہوں۔ مجھے خواب نہیں آتے۔ میں تاریکی سے نہیں ڈرتی۔ میں رات رات بھر اکیلی جنگل میں مچان پر رہ سکتی ہوں۔ میرے ہاتھ کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔ میرا دل بہت مضبوط ہے ——!"

میں چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کی گہری سبز آنکھیں کسی پر اسرار سمندر کی طرح اتھاہ تھیں۔ جوانی میں یہ عورت بے حد خطرناک اور خوبصورت رہی ہوگی —— ان آنکھوں میں آدمی ڈوب سکتا ہے۔!

میں نے کہا —— "اگر اجازت ہو۔ تو ایک سگار سلگا لوں۔ میں اتنی دیر سگار کے بغیر نہیں بیٹھ سکتا۔"

میں سگار سلگا کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔ وہ میرے چہرے کی الجھن کو دیکھ کر بولی۔ "سننے سے پہلے کچھ پوچھنا چاہتے ہو شاید ......!"

میں نے سگار کے دو تین کش جلدی جلدی سے لئے اور پھر آنکھیں ایش ٹرے میں جھکا کر بولا —" سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کیسے کوئی عجیب بات نہیں ہوئی۔ کبھی تو کچھ ضرور ہوا ہوگا۔ قتل ذاتی ہو یا میدان جنگ میں۔ ہمیشہ کہیں نہ کہیں اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے۔ اور چھوڑتا رہتا ہے۔ اور اپنی ہستی کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔ ہر قتل کی اپنی ایک زندہ اور

متحرک ہستی ہوتی ہے۔ قاتل اور مقتول سے الگ اس کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ قتل ہمیشہ بولتا ہے۔ اور اسے کبھی موت کے گھاٹ نہیں اتارا جا سکتا۔ قاتل اور مقتول کے مرنے کے بعد بھی قتل زندہ رہتا ہے۔ وہ جگہ بولتی ہے۔ جہاں قتل ہوا تھا۔ وہ ہوا کراہتی ہے۔ جس کی فضا میں کسی کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ لہو دھو دینے کے بعد بھی خنجر کی زبان ہانپتی ہے۔"!

"تم کیسی خوفناک باتیں کرتے ہو ڈاکٹر۔"؟

وہ رک رک کر بولی۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔ تقریباً سفید ہو چلا تھا۔ گلے کی رگیں کھنچ آئی تھیں میں چپ رہا۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے ہی اس نے اپنی طبیعت پر کنٹرول کر لیا۔ واقعی غضب کی آہنی ارادے والی عورت تھی میں دیکھ سکتا تھا۔ اسے اپنے آپ پر قابو پانے کے لیے کتنی جانکاہ کاوش کرنی پڑ رہی تھی۔ میں اسے توڑ دینا چاہتا تھا۔ مگر وہ ٹوٹی نہیں۔ ایک قلیل عرصے ہی میں اس کا چہرہ نارمل دکھائی دینے لگا۔ اس کی آواز بھی اصل حالت میں واپس آگئی۔ وہ کہنے لگی۔

"بیس برس کی شادی شدہ زندگی اک عمر ہوتی ہے ڈاکٹر گھوش یہ بیس برس ہمارے بہت خوش و خرم گزرے۔ کبھی کوئی ناگوار بات ایک دوسرے سے نہیں ہوئی۔ میں وہ والہانہ

محبت تو نہیں حاصل کر سکتی تھی جو انہوں نے ارملا کو دی تھی۔ ہاں مگر پھر بھی ایک گہری سمجھ، قربت، رفاقت اور جسم کی دلدار محبت بہت کچھ دیا انہوں نے .... بیس برس ہم لوگ ساتھ رہے۔ بیس برس بہت گھومے۔ یوروپ گھومے دنیا گھومے، عزت دولت، شہرت، حکومت سب کچھ ہمارے پاس تھا۔ کبھی کسی چیز کی کمی نہیں رہی۔ ہولے ہولے۔ میں بھی بھول گئی کہ ارملا نام کی میری کوئی بہن بھی تھی۔ ہولے ہولے وہ بھی شاید بھول گئے ہوں گے۔ ایسا ان کے برتاؤ سے ہمیشہ میں نے سمجھا مگر ان بیس برسوں میں ایک عجیب بات ضرور ہوئی۔ ان بیس سالوں میں میرے پانچ بچے ہوئے اور پانچوں کے پانچوں مر گئے۔

میں نے چونک کر رانی جی کی طرف دیکھا۔ مگر اس عورت کا چہرہ اس وقت ایک مکمل نقاب تھا۔ بہترین اداکارہ ہے یہ عورت۔ میں نے اپنے دل میں سوچا۔ اور یہ سوچ کر میرے دل میں ایک سرد جھرجھری سی دوڑ گئی۔!

"کیا پانچوں لڑکے تھے۔؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ — پہلے چار لڑکے ہوئے۔ پانچویں لڑکی تھی۔ لڑکے تو دو دو تین تین سال کے ہو کے جاتے رہے۔ مگر لڑکی تو ڈیڑھ سال کی ہو کے مرگئی۔ اس کی شکل ہو بہو ارملا سے ملتی تھی۔!"

ہیں میں نے پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مگر وہاں پھر کچھ نہ تھا۔ محض ایک نقاب تھا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"کنور جی اسے بہت چاہتے تھے۔ ہر وقت اسے اٹھائے پھرتے جب چھ ماہ کی ہو گئی۔ تو ہر روز اپنے ساتھ بستر پہ سلاتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے اسے نہلاتے دھلاتے۔ کپڑے پہناتے۔ کھانا کھلاتے کبھی اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ وہ دنیا کو بھول گئے۔ اپنے مرتبے کو بھول گئے۔ اپنے کام بھول گئے۔ مجھے بھول گئے ایسا لگتا تھا جیسے ارملانے مجھے جلانے کے لئے میری ہی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ !"

"کیا آپ اس سے محبت نہیں کرتی تھیں۔؟"

"یہی تو مصیبت تھی ــــــ میں خود ہی اس بچی کو وہ محبت نہ دے سکی۔ جو اس سے پہلے پیدا ہونے والے چار بچوں کو میں نے دی تھی ــــــ ممکن ہے دیتی ــــــ مگر اس کی شکل اربلا سے اس قدر مشابہ نہ ہوتی ــــــ مگر جوں جوں میری بچی کی شکل نکھرتی جارہی تھی ــــــ میں اس سے خائف ہوتی جارہی تھی۔ ــــــ گو کنور جی کے سامنے یا دنیا کے سامنے میں نے کبھی اپنے خوف کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ مگر اس بچی کو دیکھ کر ہر لحظہ مجھے یہ خدشہ رہنے لگا تھا۔ کہ ابھی کوئی بری بات ہونے والی ہے ــــــ ابھی کوئی بری بات ہونے والی ہے ــــــ ہر وقت دل دھک دھک سا کرتا رہتا۔

وہ بڑی عجیب و غریب بچّی تھی ۔ ایکبار میں پرانی تصویروں کا البم کھولے دیکھ رہی تھی ۔ کہ وہ بھی گھٹتے گھٹتے میرے قریب آگئی ۔ اور تصویریں دیکھنے لگی ۔ اتفاقاً سامنے ارملا کی تصویر آگئی ۔ میں نے جلدی سے تصویر کو پلٹنا چاہا ۔ مگر اس نے ہاتھ رکھ دیا ۔ اور توتلے لہجہ میں بولی ۔ کیونکہ اب وہ ڈیڑھ سال کی ہو چکی تھی ۔ اور تھوڑا تھوڑا بولنے لگی تھی ۔ تصویر پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے پوچھنے لگی ۔

"کون ؟ کون ۔ ؟"

میں نے کہا ــــــ "میری بہن .... بہن ۔ !"

"ایں ـــــ ؟ ایں ۔ ؟" وہ پوچھنے لگی ۔

"ہاں میری بہن ۔ !"

وہ جھک کر تصویر پہ لیٹ گئی ۔ اور ارملا کا منہ چومتے ہوئے بولی ۔

"ایں ـــــ چوچو ۔ !"

"یعنی تمہاری بہن بہت اچھی ہے ۔ جس چیز کو اچھا کہنا ہوتا ۔ اسے وہ چوچو کہتی تھی ـــــ ماما چوچو ـــــ آیا چوچو ۔ گڑیا چوچو ـــــ سب چوچو تھے ـــــ سوائے اس کے پاپا کے جو اس کے اور صرف اس کے اپنے تھے ـــــ "پاپا میلے" تھے (پاپا میرے !) باقی سب چوچو تھے ـــــ

بس پاپا میلے ....!"

عجیب و غریب لڑکی تھی۔ کبھی کبھی بالکل بڑوں کی طرح مجھے جلاتی تھی۔ ایک بار سردیوں کے دن تھے۔ وہ بہت دیر سے آئے۔ میں نے دیر تک انتظار کر کے آخر کھانا کھا لیا اور پھر بچی کو لے کر خوابگاہ میں چلی گئی ـــــ میں تمہیں بتا چکی ہوں ـــــ کہ وہ کنور جی کے بستر پر سوتی تھی۔ اس کے پاپا ابھی آئے نہ تھے۔ مگر اس نے مجھ سے ضد کی کہ میں اس کو ان کے بستر پر لٹا دوں ـــــ میں نے کہا۔ ابھی تمہارے پاپا آئے نہیں ہیں۔ تم میرے بستر پر سو جاؤ ـــــ مگر وہ نہیں مانی۔ اپنے پاپا کے بستر پر سونے کے لئے اصرار کرتی رہی اور ہاتھ پیر ٹپک کر روتی رہی ـــــ آخر تھک ہار کر میں نے کھلائی سے کہا۔ کہ اسے اس کے پاپا کے بستر ہی پر لٹا دے۔

جب کھلائی اسے دوسرے بستر پر لٹا کر چلی گئی۔ تو بچی جو دونوں آنکھیں بند کئے دم سادھے پڑی تھی ـــــ یکایک آنکھیں کھول کر شرارت سے میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اور اپنی ننھی ننھی باہوں سے اپنے پاپا کے چھپر کھٹ پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگی ـــــ "پاپا میلے ...... پاپا میلے ......!"

"ہاں۔ ہاں پاپا تیلے ...... پاپا تیلے ہی بھلے۔ تو ہی سنبھال ـــــ مجھے کیا کرنا ہے تیرے پاپا کو لے کر۔ !"

"ہاں ! پاپا میلے !" وہ معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

اور اتنا کہہ کر زور زور سے ہنسنے لگی ـــــ ڈاکٹر گھوش میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ کہ اس وقت اس ڈیڑھ سال کی بچی کی وہ نگاہیں کتنی پرانی اور معنی خیز تھیں ـــــ مجھے ایسا لگا۔ جیسے ارملا مجھے چیلنج کر رہی ہے۔ براہ راست میری کھلّی اڑا رہی ہے۔ اس بچّی کے قہقہے میں کتنی شدید تضحیک تھی۔ میرے لئے .... اور اس قہقہے کی گونج بالکل ارملا کے قہقہے کی طرح تھی۔ !"

"یہ آپ کا واہمہ تھا ـــــ" میں نے رانی جی سے کہا ـــــ "آپ کے حد سے بڑھتے ہوئے شبہات نے اس معصوم بچّی کی نگاہوں میں سب پڑھ لیا۔ جو وہاں تھا ہی نہیں۔!"

"نہیں ایسا نہیں ہے ـــــ" رانی جی قطعیت سے بولیں ـــــ "میں واہموں میں نہیں پڑتی ـــــ لیکن نگاہوں کا مطلب بھی خوب جانتی ہوں۔ جوں جوں وہ بڑی ہو رہی تھی ـــــ میرا دلی ہیجان بڑھ رہا تھا۔ بڑی ہو کر کیا کرے گی کس طرح مجھ سے انتقام لے گی ـــــ اب یہی فکر مجھے دن رات کھائے جا رہی تھی ـــــ ایک تو اس کا میری کوکھ سے پیدا ہونا ہی میرے لئے سوہانِ روح تھا۔ اور پھر اسی کو پالنا۔

اور اسی کو اپنی بچی کہنا ـــــ اور اس سے پیار کرنے کی کوشش بھی کرنا میرے لئے یہ باتیں ـــــ کس قدر اذیت کا باعث تھیں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس بچی کا کیا کروں۔؟ اتنے میں ایک ایسا عجیب و غریب واقعہ ہوا جس نے مجھے جلد ہی فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

"کیا ہوا۔؟"

"کنور جی کو فلو ہوا ـــــ فلو تم جانتے ہو چھوت کا مرض ہے ـــــ بچوں میں بہت جلد سرائیت کرتا ہے۔ کنور جی بچی کو اپنے ساتھ سلاتے تھے ـــــ آج کہنے لگے۔ اسے آج تم اپنے ساتھ سلالو ـــــ میں نے کہا ـــــ کھلائی اسے بچوں کے کمرے میں سلا دے گی۔ خود بھی وہیں سو جائے گی ـــــ مگر وہ نہیں مانے۔ اصرار کرتے رہے کہ میں ہی اسے اپنے ساتھ سلاؤں۔!

مجھے معلوم تھا کنور جی کو چھوڑ کر وہ کسی طرح میرے سنگ سونے پر تیار نہ ہو گی ـــــ اسی لئے میں ناں کر رہی تھی: مگر آخر کو ماں تھی، کب تک انکار کرتی ـــــ بچی کو اپنے سنگ سلانے پر راضی ہو گئی۔ مگر اب وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ بچی کسی طرح رات کو کنور جی سے الگ سونے پر تیار نہ تھی۔ بہت روئی۔ بہت روئی۔ بہت غل مچایا اس

نے — جب میں نے دھر کے ایک طمانچہ دیا۔ تو سہم کر میرے ساتھ سونے پر تیار ہو گئی۔ دیر تک میرے بستر پر لیٹی سسکتی رہی۔ آخر کار میرے سینے سے لگ کر سو گئی۔

پھر ایسا ہوا کہ آدھی رات کے وقت مجھے اپنا دم گھٹتا سا محسوس ہوا — جیسے کسی نے میرے گلے میں پھندا ڈال دیا ہو۔ اور اب وہ کس کر میرا گلا گھونٹ رہا ہو — میں ہڑبڑا کر جاگی۔ اور جب میری آنکھ کھلی۔ تو کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ اور میرے پلنگ کے آس پاس کوئی نہ تھا — مگر میرا دم تھا کہ مسلسل گھٹتا جا رہا تھا — سانس بڑی مشکل سے آ رہا تھا۔ یکایک میرا ہاتھ میری گردن پر گیا — اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے گلے میں پڑا ہوا میرے سہاگ کا منگل سوتر۔ جو ہر وقت میرے گلے کا ہار بنکر پڑا رہتا تھا۔ میری گردن کے گرد بڑے زور سے کس دیا گیا ہے۔ یا کسی نے کس دیا ہے — میں نے دوسرے ہاتھ سے فوراً روشنی کی تو دیکھا کہ بچی بے خبر میرے سینے سے لگی سو رہی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ میرے سینے پر ہے اور اس کا دوسرا ہاتھ منگل سوتر کی سنہری زنجیر کو میری گردن کے گرد کس رہا ہے یہ کم بخت مردار اد ملا گیا سچ مچ اس بچی کی شکل میں میری جان لینے کو آئی ہے — میں نے بڑی مشکل سے اس کے ہاتھ سے اپنے منگل سوتر کو علیحدہ کیا — اس چھوٹی بچی کی انگلیاں کی کیسی زبردست

پکڑ رکھی تھی ___ کسی طرح وہ اس منگل سوتر کو اپنی انگلیوں سے علیٰحدہ کرنے پر تیار نہ تھی - بلکہ اسے اور کسے جا رہی تھی - میں نے ہاتھ کے ایک زوردار جھٹکے سے جب منگل سوتر کو اس کے ہاتھ سے الگ کیا - تو یکایک وہ جاگ گئی - اور چیخ چیخ کر رونے لگی - اس قدر روئی اس قدر روئی کہ کنور جی دوسرے کمرے سے بھاگے بھاگے آئے ___ اور فلو کے باوجود اپنی لڑکی کو اٹھا کر اپنے بستر پر لے گئے ___ میں نے اطمینان کا سانس لیا - کم بخت نے آج تو میری جان ہی لے لی تھی ___ !!"

"ڈیڑھ سال کی بچی آپ کی جان کیسے لے سکتی تھی - رانی صاحبہ ___ وہ تو بچی کا ہاتھ سوتے میں آپ کے منگل سوتر پر پڑ گیا ہوگا ___ اور نیند میں الجھ گیا ہوگا - ایسی معمولی فطری سی بات کو آپ اس قدر پر اسرار رنگ دے رہی ہیں - !"

" اگر آپ کے ساتھ یہی واقعہ اسی طرح پیش آتا - تو آپ ہرگز نہ کہتے - اس واقعہ نے ، اتفاق نے ، حادثے نے کچھ بھی کہو ___ مجھے خبردار کر دیا - مجھے اچھی طرح سے جتا دیا کہ آنے والے شب و روز میں یہ لڑکی کیا رنگ لائے گی - ابھی سے ایک طرح سے اس نے کنور جی کو مجھ سے چھین لیا تھا - جو کام ارملا میری بہن بن کر نہ کر سکی تھی - وہ کام اس نے میری بچی بن کر پورا کر لیا تھا - !"

میں نے مزید بحث میں الجھنا بیکار سمجھ کر خاموشی اختیار کرلی۔ رانی جی کی آنکھیں بند تھیں۔ اور ہونٹ سختی سے اندر کو بھنچے ہوئے تھے۔ جیسے اب انہیں جو کچھ کہنا ہے۔ وہ اسے کہنا نہیں چاہتیں۔ یا کہنا بھی چاہتی ہیں تو اس کے لئے انہیں الفاظ ہی نہیں ملتے۔ اور اگر الفاظ ملتے ہیں تو شاید لہجہ نہیں ملتا۔

"پھر ــــ؟" میں نے پوچھا۔

"پھر وہ مرگئی۔ ــ!"

رانی جی نے بڑے ٹھنڈے اور چپے تلے لہجہ میں کہا۔ میں چونک کر ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا ـــــ کیسی غضب کی عورت ہے ـــــ ! اس نے ان الفاظ کو اس طرح ادا کرنے کیلئے اپنی طبیعت پر کتنا جبر کیا ہوگا ـــــ اور اس کے لئے کتنا بڑا روحانی تاوان دیا ہوگا ـــــ کوئی معمولی عورت ان الفاظ کو اس طرح سے ادا نہیں کر سکتی۔ کئی بار جب لاوا کھول کھول کے مرتا ہے ـــــ تو ایک چٹان تیار ہوتی ہے۔

"کیسے مر گئی ـــــ ؟" میرے منہ سے نکلا۔

"جیسے بچے مرتے ہیں۔ دو دن بخار ہوتا ہے۔ تیسرے دن دم دیتے ہیں۔ بچے تو پھول کی طرح نازک ہوتے ہیں۔!"

"کنور جی اس وقت کہاں تھے ـ ؟"

"کنور جی بچی کو میری تحویل میں دے کے گئے تھے۔ صبح سامنے وہ نہ جاتے۔ اور اگر جاتے تو بچی کو ساتھ لیکر جاتے۔ مگر افتاد ہی ایسی آن پڑی تھی ـــــ ان کے چاچا جو خود ایک بہت بڑے تعلقدار تھے۔ بستر مرگ پر پڑے تھے۔ اور انہوں نے سوار بھیج کر کنور جی کو فوراً بلایا تھا ـــــ انہیں جانا پڑا ـــــ پہلے تو وہ بہت لیت و لعل کرتے رہے۔ نہ جانے کے لئے بہانے بناتے رہے ـــــ مگر آخر کو میرے سمجھانے بجھانے پر بدلِ ناخواستہ چلے گئے ـــــ ان کے جانے کے دو دن بعد بچی کو بخار آ گیا۔ دو دن بخار رہا تیسرے دن وہ مرگئی۔ جب وہ واپس آئے تو نیم پاگل سے ہو گئے ـــــ اسی وقت پہلی بار مجھے شبہ ہی نہیں یقین ہو گیا کہ وہ ارملا کو کبھی نہیں بھولے تھے۔!"

وہ چپ ہو گئی۔ مگر اس کا سارا جسم مرتعش تھا۔ کسی اندرونی زلزلے سے کانپ رہا تھا۔ وہ دیر تک چپ رہی۔ اور دیر تک میری توجہ اپنے سگار پر رہی ـــــ اور میں کچھ نہیں بولا۔ کیونکہ میں تو کہانی سننے والا تھا۔ میں کیا کہہ سکتا تھا۔!"

بہت دیر کے بعد وہ بولی۔ "اب وقت کیا ہوگا؟"

میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "چھ بجنے میں آدھا گھنٹہ باقی ہے۔!"

"وقت قریب آ رہا ہے۔" وہ بڑے پر اسرار لہجہ میں

بولی۔

"کاہے کا ـــــــ ؟" میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

"ابھی تھوڑی دیر میں تم سب جان جاؤ گے ۔ !"

وہ مجھے تسلّی دیتے ہوئے بولی۔ "جلدی مت کرو۔ ابھی سب جان لوگے۔ اب میں کہانی کے آخری حصّہ پر پہنچ رہی ہوں۔!"

"آگے چلنے سے پہلے ایک بات پوچھ لوں۔ وہ لڑکی خود مری تھی یا ماری گئی تھی۔ ؟"

معاً اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھاکر اپنے سینے پر رکھ لیئے۔ چند لمحوں کے لیئے وہ اس طرح کانپتی رہی جیسے طوفان کی زد پر آیا ہوا کانپتا ہے۔ پھر یکایک وہ ساکت ہوگئی بڑے بچے تلے لہجہ میں وہ رک رک کر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہنے لگی

"میں تم سے کہہ چکی ہوں۔ میں نہ جھک سکتی ہوں۔ نہ ٹوٹ سکتی ہوں۔ !"

بچّی کے مرنے کے بعد چند دن تک کتور جی تیم پاگل سے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ وہ پھر اپنے کاموں میں مشغول رہنے لگے۔ بدستورِ سابق میری دلداری کرنے لگے۔ انہوں نے ہر اس تبدیلی کو مٹا ڈالا جو گزشتہ ڈیڑھ سال میں بچّی کی حیات چند روزہ

ان کے لئے لائی تھی۔ مگر اتنا میں نے ضرور محسوس کیا۔ جیسے وہ بجھ سے گئے ہیں۔ غائب سے رہنے لگے ہیں۔ دنیا کی تمام دلچسپیوں گھریلو مشاغل اور میری طرف سے شدید محبت کے اظہار کے باوجود اندر ہی اندر کہیں گم رہنے لگتے ہیں — میں بہت ست پٹائی، طرح طرح کی کوششوں سے میں نے ان کا دل لگانا چاہا۔ مگر اب ہر بات میں ان کی دلچسپی اوپری تھی۔ میں تم سے کہتی ہوں کہ ہزار دنیا دار ہونے کے باوجود وہ بہت معصوم آدمی تھے — بھروسہ کرنا ان کی فطرت تھی۔ اور شبہ کرنا ان کی فطرت کے خلاف — مگر پہلی دفعہ میں نے دیکھا۔ کہ ان کی صاف اجلی نگاہ میری طرف دیکھتے ہی اب دھواں، دھواں سی ہونے لگتی تھی۔ اک عجیب بے چین مضطرب کھولتا ہوا گدلاپن۔ ان میں آجاتا تھا۔ اور وہ جلدی سے ان نگاہوں کو چھپانے کے لئے اپنی آنکھیں جھپکا لیتے تھے یا ادھر ادھر دیکھنے لگتے تھے۔ مگر میں بے خبر نہ تھی — اور ان کی طرف سے پریشان رہنے لگی تھی۔!"

لڑکی کی موت کے بعد کنور راج میں گہری تبدیلی آئی — ان کا مزاج تنہائی پسند ہوتا گیا — وہ اکیلے رہنے کو دوسروں کے ساتھ رہنے پر ترجیح دینے لگے — اس سے پہلے

وہ خاصے Extrovert تھے۔ انہیں لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ چہل کرنا۔ شکار پر جانا۔ رات گئے دیر تک محفل جمانا ــــــ غرضیکہ بے فکر روسا کے سارے مشاغل انہیں بعید پسند تھے ــــــ ایک ایک کر کے وہ سارے مشاغل چھوڑتے گئے ــــــ اور لوگوں سے کٹ کر اکیلے ہوتے گئے ــــــ راج دربار کے کاموں میں ڈھیل ڈالنے لگے ــــــ بحث ومباحثے کے وقت اکثر چپ رہتے ــــــ ایسا لگتا تھا جیسے بہت سی باتوں سے ان کی دلچسپی اکدم غائب ہو گئی ہے۔

اس سے پہلے ہم دونوں دن بھر ساتھ رہا کرتے تھے وقت کا خاصہ حصّہ اکٹھے گزرتا تھا ــــــ زنانے میں بھی بہت آتے تھے ــــــ اب دن بھر نہیں آتے تھے ــــــ ہولے ہولے رات کو بھی دیر سے آنے لگے ــــــ کچھ عجیب ساحال ہو گیا تھا ان کا ــــــ بات کرو۔ تو آدھی بات کا جواب دیتے تھے۔ آدھی گول کر جاتے تھے۔ زیادہ سوال کرو تو چپ ہو جاتے، کوئی بحث چھیڑو ــــــ تو بظاہر دلچسپی لیتے ہوئے اندر ہی اندر کہیں غائب ہو جاتے ــــــ بہت دیر کے بعد مجھے پتہ چلتا کہ میں بیکار کی جھک مار رہی تھی۔ وہ تو سن ہی نہیں رہے تھے ــــــ ان باتوں سے طبیعت بہت الجھنے لگی تھی۔!

پھر اکھٹے تین دن اور تین راتیں وہ زنانے میں نہیں آئے ــــ میں بہت پریشان ہوگئی ــــ اور تین دن کے بعد جب انہیں دیکھا تو اور بھی پریشان ہوگئی۔ داڑھی بڑھی ہوئی ــــ ماتھے پر شکنیں۔ چہرہ سوچ میں ڈوبا ہوا ایسا لگتا تھا جیسے تین دن سے نہ نہائے ہیں نہ کپڑے بدلے ہیں۔!

"یہ کیا حلیہ نبا رکھا ہے؟" آخر میں نے بھی اس امر کا فیصلہ کرنیکا تہیّہ کر لیا۔

"کیا ــــ؟" وہ چونک کر بولے۔

"آئینے میں اپنے آپ کو دیکھیے۔!"

"دیکھ لیا......" وہ بیزاری سے بولے۔ "اس محل کے سارے آئینے غلط ہیں۔!"

"غلط ہیں۔؟"

"ہاں ــــ جو میں ہوں وہ یہ دکھاتے نہیں۔ جو دکھاتے ہیں وہ میں نہیں ہوں۔!"

"تو کیا کرنا چاہیئے۔؟"

"تم بھی آئینے میں دیکھا مت کرو۔ اس محل کے سارے آئینے جھوٹ بولتے ہیں۔!"

"تین دن تک آپ زنانے میں نہیں آئے۔ مجھ سے

ملے نہیں۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی ہیں۔ !"

"مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ !"

"پرواہ تو مجھے بھی نہیں ہے۔ مگر زندگی نے جو مرتبہ ہمیں دیا ہے ــــ اس کے تقاضے یہی کہتے ہیں کہ آداب کو کسی قیمت پر ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ !"

"اور آداب کیا کہتے ہیں۔ ؟"

"آپ کو روز رات کو زنانے میں آنا چاہیئے۔ ناشتے کے وقت ناشتہ اور کھانے کے وقت کھانا۔ اور راج دربار کے کام کے وقت راج دربار کا کام کرنا چاہیئے ــــ آپ کی ایک بیوی بھی ہے۔ !"

"اوہ ! " کہہ کر وہ ہنستے۔ بڑھی ہوئی داڑھی میں مجھے ان کی ہنستی آنکھ چہرہ۔ ان کی سوچ میں ڈوبی ہوئی۔ مسکراہٹ بہت اچھی لگی۔ ایسا لگا جیسے وہ اجنبی ہوں ــــ اور آج پہلی مرتبہ میرے راج محل میں آئے ہوں ــــ میرا دل پہلی رات کی طرح ان کے لئے دھک دھک کرنے لگا۔ میں لڑائی کرنے آئی تھی۔ جھگڑنے آئی تھی۔ مگر ان کی مسکراہٹ دیکھ کر سارا غصّہ کافور ہو گیا ــــ میں بے اختیار ان کے پاس چلی گئی۔ انہوں نے مجھے اپنی باہوں میں لے لیا۔ ان کے جسم سے ایک عجیب سی خوشبو آ رہی تھی۔ !

"یہ کیسی خوشبو ہے۔ ؟" میں نے ان کی باہیں۔ ان کا کندھا۔ ان کا سینہ۔ جگہ جگہ سے سونگھ کر کہا۔

"چندن کی خوشبو ہے۔ !"

"ہاں ! " میں نے پھر سونگھ کر کہا۔ "ہاں۔ چندن ہی تو ہے۔ مگر کیوں۔ ؟"

"ایک تجربہ کر رہا ہوں —— !" وہ عجیب لہجہ میں بولے۔ !

"کیسا تجربہ ۔ ؟"

"جب مکمل ہو جائے گا۔ تو بتا دوں گا۔ !"

"میں تو ابھی معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ !"

"ابھی تو مجھے خود بھی نہیں معلوم !"

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلے گئے —— اور پھر چار روز تک نہیں آئے۔ !"

اتنا مجھے معلوم تھا۔ کہ وہ ہیں گرڑھی ہیں۔ انہوں نے گرڑھی کے سب سے اوپر اور سب سے اونچے حصّے ہیں جسے ہم ٹاور کہتے ہیں۔ اپنا کمرہ بنا لیا تھا ـــــ اور اسی میں اپنے آپ کو دن رات بند رکھتے تھے اور وہاں سے رات دن عجیب عجیب اوزاروں کی آوازیں آتی تھیں ـــــ کھٹا کھٹ ہوتی۔ کھٹ کھٹ ہوتی۔ کبھی آری کے چلنے کبھی ضرب کے لگنے۔ کبھی کیل گاڑنے۔ کبھی چھیلنے کی آواز آتی ـــــ چندن کی لکڑیاں چن چن کر منگائی جاتی تھیں۔ رنگ اور برش اور کپڑے۔ خوبصورت اور رنگین اور مختلف طرح کی چیزیں ٹاور میں شب و روز پہنچائی جاتی تھیں۔ اتنا تو میں نے معلوم کر لیا۔ مگر سمجھ میں نہ آیا۔ کہ وہ کس طرح کا تجربہ کر

رہے ہیں۔ میں چاہتی تو سیدھے اوپر ٹاور میں جا کے خود معلوم کر سکتی تھی۔ مگر مناسب معلوم نہ ہوا ــــــ اگر وہ مجھ سے کچھ چھپانا چاہتے ہیں تو چھپاتے رہیں۔ میری جوتی کو ٹری ہے جو معلوم کرنے کی کوشش کروں۔!

مگر چار روز کے بعد جب آئے تو پہلے سے بھی زیادہ غائب اور سوچ میں ڈوبے ہوئے ــــــ داڑھی پہلے سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ بھی میلا تھا۔ کالر مڑے ہوئے تھے۔ اور بدن پر اور کپڑوں پر جگہ جگہ چندن کا برادہ نظر آرہا تھا۔

"کیا چندن سے کوئی دوا تیار کر رہے ہو ــــــ؟" میں نے تنک کر پوچھا۔

"دل کی دوا ــــــ!" وہ مسکرا کر بولے۔

"کس کے دل کی دوا ــــــ؟" اپنے دل کی یا میرے دل کی۔؟"

"دونوں کے دل کی۔!"

"مرض کی نوعیت کیا ہے۔؟"

"یہی تو معلوم نہیں۔!" وہ آہ بھر کر بولے۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے۔؟"

"یہی تو معلوم کرنا چاہتا ہوں۔!"

"کب تک داڑھی بڑھاتے چلے جاؤ گے۔؟" میں نے پوچھا۔

کوئی جواب نہیں ملا۔!"

"اور راتوں کو محل سے باہر رہو گے۔!"

"پھر کوئی جواب نہیں ملا۔!"

"شاید تم اب مجھ سے پیار نہیں کرتے۔؟" میرے دل کے اندر کی عورت کہیں سے بول پڑی ——— ! میرے منع کرنے کے باوجود بول پڑی ——— اتنے برس ہو گئے تھے ہم دونوں کی شادی کو، پیار کا لفظ ایک ناکردہ گناہ کی طرح ہمارے بیچ کبھی نہ آیا تھا۔ کبھی کسی کی زبان سے ادا نہ ہوا تھا۔ پیار تو کرتے ہیں بولتے نہیں ہیں۔ پیار تو لہو پیتا ہے اور چپ رہتا ہے۔!

بیس برسوں میں جو لفظ میری زبان پر نہ آیا تھا۔ وہ آج کیوں کلمۂ شکایت بن گیا۔ میں نے اپنی زبان دانتوں تلے داب لی۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ لفظ تو زبان سے نکل چکا تھا۔ اور تیر کی طرح چل چکا تھا۔

اگر تیر چل کر کہیں الجھ گیا۔ تو بھی انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ایک لمحہ کے لئے ان کا منہ کھلا۔ ایک لمحہ کے لئے چہرے پر غصہ کا ایک رنگ آیا۔ دوسرے لمحہ ہی میں انہوں نے

تھک کر مجھ سے بڑی نرمی سے کہا۔
"آج تم میری شیمپو بنا دو۔۔!"

وہ صوفے پر لیٹ گئے۔ آنکھیں بند کرلیں۔ میں شیمپو بنانے لگی۔ یہ ان کا طریقہ تھا۔ جب وہ مجھ سے گہری قربت ظاہر کرنا چاہتے۔ مجھے شیمپو بنانے کے لئے کہتے۔۔!

مگر آج تو نہ صرف یہ کہ میں نے ان کی شیمپو بنائی۔ میں نے ان کے کپڑے بھی بدل دیئے ـــــ خود نہلایا۔ دھلایا۔ تولئے سے بدن پونچھا۔ نئے کپڑے پہنائے۔ ایک بچے کی طرح بستر پر لٹا دیا۔ انہوں نے بھی ایک بچے کی طرح لاڈ کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھا دیئے۔ اور مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور آنکھیں بند کر کے اپنا گال میرے گال سے لگا دیا۔

"تم مجھ سے پیار کرتے وقت اپنی آنکھیں کیوں بند کر لیتے ہو۔؟" میں نے پوچھا۔

ان کا سارا بدن ایک لمحہ کے لئے ساکت ہو گیا۔ پتھر کی طرح جامد ہو گیا۔ پھر ہولے سے حرکت کی رو ان کے جسم میں دوڑنے لگی۔ وہ آنکھیں بند کئے میری ٹھوڑی چوم کر بولے۔
"کیونکہ میں بند آنکھوں سے زیادہ بہتر دیکھ سکتا ہوں۔!"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔!" میرے دل نے کہا ـــ

"تم زیادہ بہتر کیسے دیکھتے ہو۔ کیا مجھے یا کسی اور کو، یہ زیادہ بہتر بہت ہی ذو معنی ہے۔ یعنی کیا میں زیادہ بہتر دکھائی دیتی ہوں ——— یا تم کسی اور کو جو مجھ سے زیادہ بہتر ہے، دیکھتے ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم حقیقت سے آنکھیں بند کر کے کسی خواب میں گم ہونے کی کوشش کرتے ہو ——— برسوں سے کرتے آئے ہو۔ یعنی میرے گالوں کے لمس میں کسی اور کے رخسار کا لمس ڈھونڈتے ہو ——— آنکھیں بند کر کے میرے ہونٹ چومتے ہیں۔ اور ان ہونٹوں میں کسی اور کے بوسے تلاش کرتے ہو۔ جسم میرا ہوا اور روح ارملا کی ہو ——— یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ تم سے یہ سوال پوچھ لوں ——— کیا میری بیس برس کی پرستش نے تمہارے دل کا کوئی داغ مندمل نہیں کیا۔ ؟ کتنے ہی سوال آتے ہیں میرے دل میں جنہیں میں پوچھنا چاہتی ہوں مگر پوچھ نہیں سکتی۔ کیونکہ تمہارے اور میرے درمیان یہی ذو معنویت تو برسوں سے پختہ ہو رہی ہے۔ اور زندگی کے اس بحرِ بیکراں میں جھوٹ کی بھی تو ایک نازک پتوار ہے جس سے ہماری شادی شدہ زندگی چل رہی ہے۔ ایسی پتوار کو بھی توڑ دوں تو پھر کیا ہو گا۔ ؟"

اس لیئے میں نے بات کا رخ ہی پلٹ دیا۔ پوچھا

"تمہارا تجربہ کامیاب رہا۔ ؟"

"ابھی آزمانا کر نہیں دیکھا ۔ !"

"کب آزماؤ گے ۔ ؟"

"دو ایک دن میں ۔ !"

"کس طرح کا تجربہ ہے ۔ ؟ میرا مطلب کیا تمہیں کیمیا گری کا شوق ہوا ہے ـــــ سنتے ہیں ۔ تمہارے دادا کو بھی شوق تھا ۔ وہ سونا بنانے کا نسخہ دریافت کرتے رہے ۔ اور اسی شوق میں لاکھوں گنوا دیئے ۔ کیا تم بھی مٹی سے سونا بنانا چاہتے ہو ۔ !"

"نہیں ـــــ !" انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا ۔ "میں سونے کو مٹی میں تبدیل کرنا چاہتا ہوں ۔ !"

"یہ کیا حماقت ہے ۔ ؟" بات میری سمجھ میں نہیں آئی ۔ !

"بات میری سمجھ میں بھی فی الحال نہیں آئی ہے ۔ اس لئے میں زیادہ تشریح کیا کروں ۔ ؟"

"سونے کو مٹی میں تبدیل کرنا ...... ؟ بھلا ایسی کیمیا گری میں کیا فائدہ ہے ۔ ؟"

"فائدہ تو میں دیکھتا ہی نہیں ـــــ" وہ بڑے پراسرار لہجہ میں بولے ۔ "میں تو اب یہ دیکھتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ نقصان کس میں ہے ۔ ؟"

"الٹی سیدھی باتیں مت کرو ...." میں پیار سے انہیں تھپک کر بولی۔ "اب سو جاؤ ــــ تمہاری آنکھوں میں کئی راتوں کی نیند بھری ہے۔ !"

"تھوڑی دیر میں مجھے ان کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سنائی دی۔

رات کے تیسرے پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو بستر خالی تھا۔ اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا ــــ باتھ روم میں دیکھا۔ کہیں نظر نہ آئے۔ گھبرا کر خواب گاہ کے باہر نکلی ــــ پہرہ دارنیوں سے پوچھا ــــ انہوں نے بتایا۔ سرکار۔ اوپر ٹاور میں گئے ہیں۔ !" اس گھری اندھیری رات میں اوپر ٹاور جانے کا کیا مطلب ؟ کیا ہو رہا ہے اوپر وہاں۔ ؟ کس طرح کا تجربہ ہے یہ۔ ؟ کیسی کیمیا گری ہے۔ ؟ کیا اس کیمیا گری کی آڑ میں انہوں نے کوئی دوسری عورت تو نہیں رکھ لی ــــ ؟ اوپر ٹاور میں ــــ ؟ عجیب احمق تھی میں جواب تک ان پر اعتبار کرتی رہی ــــ اسے معمولی بات سمجھ کر ٹالتی گئی ــــ مجھے معلوم کرنا ہی ہوگا۔ ؟"

میں ٹاور کی طرف بڑھنے لگی۔ دو پہریدارنیوں نے میرا ساتھ دینا چاہا ــــ میں نے جھڑک کر انہیں منع کر دیا۔ اور اکیلی ہی ایک مومی شمع دان ہاتھ میں لے کر چلی۔

کئی کمرے، دالان۔ غلام گردش۔ میرے قدموں کی چاپ سے گونجتے گئے ــــ رات کے سناٹے میں اپنے قدموں کی چاپ بھی عجیب معلوم ہوتی ہے ــــ جیسے کوئی دوسرا چل رہا ہو ــــ یا آپ کے قدم سے قدم ملائے آپ کے پیچھے پیچھے آرہا ہو ــــ ٹاور چوتھی منزل پر واقع ہے۔ اور گڑھی کا سب سے اونچا۔ سب سے دشوار گزار اور سب سے تاریک حصہ ہے۔ ایسا ہولناک سناٹا ہے کہ دن کو جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ پہلی تین منزلوں کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے دم پھول گیا ــــ یہاں کچھ دیر کے لئے جو بھی غلام گردش میں رکی۔ اور ہاتھوں میں شمعدان لئے کئی منٹ کھڑی رہی ــــ یہاں آکر سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا۔ جیسے سارا قلعہ دم روکے کھڑا ہو ــــ میرے سامنے ٹاور کا آہنی دروازہ تھا۔ جس کے اندر چکر کھاتا ہوا، گھومتا ہوا، بلند ہوتا ہوا پتھر کا ایک آئینہ ہے ــــ زینے سے ہٹ کر ٹاور کی گول چند دیواریں جگہ جگہ سوراخ ہیں اور اس میں پرانی وضع کی توپیں نصب ہیں۔ اور جہاں جہاں توپیں نصب ہیں۔ وہاں زینہ تنگ کر دیا گیا ہے اور توپوں کے لئے حاشیے میں جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔

ٹاور کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ میں نے دھیرے سے اسے کھول کر اندر جھانکا ــــ گھپ اندھیرا تھا۔ صرف

جہاں پر توپ کا دہانہ باہر نکالنے کے دیوار میں سوراخ تھا۔ وہاں سے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آتا تھا۔ جسکی تاریکی میں تین چار تارے لرز رہے تھے۔

دروازہ بے آواز کھلا —— میں اندر چلی گئی —— چند لمحوں تک ٹھٹھکی کھڑی رہی پھر حواس مجتمع کر کے چکر کھاتی ہوئی سیڑھیوں پر اوپر چڑھنے لگی —— بہت آہستہ آہستہ بے آواز قدموں سے موم کی شمع کی روشنی زینے کے سیکڑوں برس پرانے پتھروں پر پڑ رہی تھی۔ جن کا رنگ کسی زمانے میں نیلا ہوگا۔ مگر اب سیاہی مائل ہو چکا تھا —— ہوا رکی رکی سی تھی۔ گول زینے پر چڑھتے ہوئے ایک اور عجیب احساس ہوتا ہے۔ چونکہ ہر چند گز کے فاصلہ پر آگے آنے والی سیڑھیاں نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ہر چند گز کے فاصلے پر اک نئے خطرے کا احساس ہوتا ہے۔ جو رات کی تاریکی میں رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ اور میں جو جنگل کی گھٹا ٹوپ تاریکی سے نہیں گھبراتی۔ اس وقت اس اجنبی وقت میں اس ٹاور پر چڑھتے ہوئے ایک عجیب خطرہ سا محسوس کر رہی تھی۔ مگر پھر بھی میں نے دل کڑا کیا اور ہمت کر کے اوپر چڑھتی گئی —— آگے بڑھتی گئی۔ کہیں۔ کہیں۔ پر رک رک کر دم لیتی —— موم کی شمعدان کو اپنے آنچل کی آڑ میں چھپا کر پھر اوپر چڑھنے لگتی —— باہر

کی زور دار ہوا ان سوراخوں سے ٹکرا کر جہاں توپوں کے دہانے رکھے ہوئے تھے۔ عجیب سی آوازیں پیدا کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔ ہُو ۔۔۔۔۔۔۔ ہُو ۔۔۔۔۔۔ ہُو ۔۔۔۔ ! جیسے جنگل کی بد روحیں یا ٹاور کے بھوت پریت مجھ پر ہنس رہے ہوں ۔۔۔۔ مگر کچھ بھی ہو جائے مجھے تو اب آگے جانا ہی ہے۔ اور اوپر ٹاور کے کمرے میں پہنچ کر یہ دیکھنا ہے کہ وہ اس تیسرے پہر رات میں اکیلے اس ٹاور میں کیا کر رہے ہیں۔ ؟

زینے کا آخری چکر اب میری نگاہوں کے سامنے تھا اونچی جاتی ہوئی کوئی پچیس سیڑھیوں کے اوپر ٹاور کا وہ کمرہ تھا۔ جس کے اوپر قلینے کا ایک تیتی وضع کا تانبے کا فانوس لٹکا ہوا تھا۔ جس کی پیلی کمزور روشنی سیڑھیوں کی تاریکی میں ایک زرد ہالہ سا بنا رہی تھی۔ جو فضا میں لرزتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ چاروں طرف تاریکی اور بیچ میں روشنی کا ایک زرد کمزور سا ہالہ۔ تاریکی کے سمندر میں ایک کمزور کشتی کی طرح لرزتا ہوا۔ !

یہاں میں دم لینے کے لئے رکی۔ ٹاور کا چوبی دروازہ اندر سے بند تھا۔ سیڑھیوں پر کوئی نہیں تھا۔۔ فانوس کی زرد پیلی لرزتی سی روشنی سناٹے کی ہیبت میں اور بھی اضافہ کر رہی تھی۔

میں نے شمعدان کو زینے کی ایک سیڑھی پر رکھ دیا۔
اور دوسری سیڑھی پر خود بیٹھ کر اپنے کپڑے ٹھیک کرنے لگی۔
پھر اپنے بال ٹھیک کیے۔ پھر شمعدان اٹھانے کو ہاتھ جو
بڑھایا ___ تو ہوا کا ایک تیز جھونکا کہیں سے آیا۔ اور شمعدان
میرے ہاتھوں میں گل ہو گیا ___ تاریکی اور بھی گہری ہو گئی۔
پھر نہایت ہولے ہولے اوپر ٹاور کا دروازہ کھلنے لگا۔
دھیرے دھیرے کھلتا گیا۔ اور ایک صورت نمودار ہوئی۔ جسے
دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور میں وہیں سیڑھیوں
پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

"یہ ادریلا تھی۔ !"

پھر جیسے ارملا نے مجھے دیکھ لیا ۔ اور مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف بڑھنے لگی ۔ سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی — ہونٹوں پہ ایک عجیب تضحیک آمیز مسکراہٹ تھی — ہولے ہولے وہ تاریکی گنبد نما تاریکی میں اترتی ہوئی میری طرف دھیرے دھیرے گویا تاریکی میں تیرتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی ۔ ہولے ہولے اس کا وہ تضحیک آمیز تبسم والا چہرہ میرے قریب آتا جاتا تھا — میرے قریب آتا جاتا تھا ۔ خوف اور دہشت سے میں نے چیخ مارنا چاہی ۔ مگر میری طاقت گویائی مجھے جواب دے گئی ۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری زبان میرے تالو سے چپک گئی ہے ۔ میں نے اٹھ کر بھاگنا چاہا ۔ مگر میرے قدم وہیں گڑھے کے گڑھے رہ گئے — اس کا چہرہ میرے قریب آتا گیا ۔ قریب

آتا گیا۔ یکا یک سارا زینہ میرے گرد چکر کھانے لگا ــــ اور ہُو ہُو کر کے لاکھوں چمگادڑیں میرے ذہن میں شور مچانے لگیں۔ پھر وہ چہرہ یکا یک تاریکی میں گھل گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میرے احساس بھی ــــ پھر مجھے یاد نہیں کیا ہوا ــــ شاید میں وہیں خوف اور دہشت سے ان سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے بیہوش ہو گئی تھی۔

جب میں ہوش میں آئی۔ تو میں اپنے بستر پر تھی۔ اور وہ گہری سنجیدگی اور انہماک سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر انہوں نے سکون کا ایک سانس لیا۔ اور پیچھے ہٹ کر میرے بستر کے قریب ایک آرام کرسی پر دراز ہو گئے اور ایک ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا۔ جس سے میں ان کی آنکھیں نہ دیکھ سکتی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد جب میں بولنے کے قابل ہوئی ــــ تو میں نے پوچھا۔

"وہ امریلا تھی نا۔ ؟"

وہ سر ہلا کے بولے ــــ "نہیں وہ لکڑی کا ایک پتلا تھا۔ !"

"لکڑی کا پتلا۔ ؟"

"ہاں ــــ میں تم سے ایک نئے تجربے کی بات نہیں

کر رہا تھا ـــــ سو وہ تجربہ وہی تھا ـــــ میں اوپر ٹا وریں شنبھو دادا سے لکڑی کے قدآدم پتلے تیار کرا رہا ہوں۔ سوچا تھا۔ رام نومی پر ان پتلیوں کی مدد سے راماین کا ڈرامہ کھیلوں گا ـــــ نئی چیز ہو گی اور ہمارے علاقہ کے لیئے بہترین۔ یہاں نہ تو تھیٹر ہے نہ سینما۔ بیچارے غریب لوگوں کی تفریح کا کوئی سامان نہیں ہے پتلیوں کے کھیل ہیں مگر پرانی وضع کے ـــ میں نے سوچا شنبھو دادا کی مدد سے نئے پتلے بنوا کر نئے ملبوس اور نئے ساز و سامان سے ایک نیا کھیل کھیلا جائے۔ میں تم سے یہ تجربہ اس لئے راز میں رکھ رہا تھا کہ میں رام نومی کے موقعہ پر اچانک تمہیں یہ کھیل دکھا کر مبہوت کر دینا چاہتا تھا ـــــ مگر تم وقت سے پہلے آگئیں ...... راماین کی گڑیا کیتھا دیکھنے سے پہلے ....!

"مگر ...... مگر ......" میں نے کہا۔ اس تپلے کی شکل تو ہو بہو ـــــ ہو بہو ـــــ!

"اُرملا سے ملتی ہے ـــــ ہے نا۔؟ ہاں ٹھیک ہے۔ وہ تپلا لکشمن کی بیوی کا تھا ـــــ جس نے اپنے پتی کے بچھڑنے پر چودہ سال ایک برہمن کا بن باس کاٹا ...... یاد ہے؟" کنور جی نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

× × × × ×

"میرا خیال ہے اس کا تجربہ کامیاب رہا۔"

میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ڈاکٹر گھوش!" رانی جی اپنی بے چین انگلیاں جلدی جلدی ایک دوسرے میں گڈمڈ کرتی ہوئی بولیں ـــــ "میرا خیال ہے رامائن کی گڑیا کتھا کا تو ایک بہانہ تھا ـــــ وہ اس کھیل میں ارملا میری بہن کی شکل کی ایک قدِ آدم گڑیا بنا کے میرا امتحان لینا چاہتا تھا ـــــ شاید وہ مجھے ساری پبلک میں بے نقاب کرنا چاہتا تھا ـــــ یہ ٹھیک سے میں نہیں جانتی کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ مگر اتنا ضرور جانتی ہوں۔ کہ اس دن جب وہ ارملا کے اس قدِ آدم پتلے کے پیچھے چھپا ہوا اسے سیڑھیوں سے نیچے اتار رہا تھا۔ اس وقت اس نے مجھے دیکھ کر اپنے تجربے کی آزمائش کا فیصلہ کر لیا ہو گا ـــــ وہ بہت اچھا موقعہ تھا۔ اس کے لئے ـــــ اور اس نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا ـــــ مجھے اچانک خبردار کئے بغیر اس نے اس پتلے کے ذریعہ اس گہرے احساس جرم کو میری آنکھوں میں پڑھ لیا۔ جواب تک اس کی آنکھوں سے اوجھل تھا۔

رانی جی کی آنکھوں میں اس وقت ناسفت کی ایک

گہری اداسی تھی۔

"پھر کیا رامأین کی وہ گڑیا کتھا کا کھیل بھی کھیلا گیا۔ ؟"

"نہیں ——— میں نے کینسل کرا دیا۔ وہ کھیل تو ایک طرح سے کھیلا ہی جاچکا تھا۔ !"

"اور ارملا کی وہ گڑیا ....؟"

"اسے میں نے جلوا دیا۔ !"

"جلوا دیا۔ ؟"

"ہاں ——— یہ کہہ کر جلوا دیا۔ کہ چونکہ میری بہن کی لاش نہیں ملی تھی ——— اس لئے اسے جلوا دینا چاہیئے ——— اس سے اس کی بھٹکی ہوئی روح کو شانتی دینے کے لئے میں نے صندل کی لکڑی کا یہ پتلا بنوایا ہے ——— اور اب اسے ارملا کی برسی کے روز باقاعدہ ارتھی اٹھا کر شمشان گھاٹ میں جلایا جائے گا ——— میرے اس فیصلے کو پبلک نے بہت پسند کیا۔ اس ارتھی کے ساتھ کنور راج بھی گئے تھے ——— مگر عجیب بات یہ تھی۔ کہ اس روز شمشان گھاٹ جاتے ہوئے اس ارتھی کے ساتھ انہوں نے کسی خاص غم کا اظہار نہیں کیا۔ نہ ارتھی اٹھاتے وقت نہ شمشان گھاٹ میں جلاتے وقت۔ واپس آکر ہم لوگ پرانے دستور کے مطابق کچھ دیر اسی تنگ کے پیڑ کے

نیچے ٹہلتے رہے ۔ جس کے قریب کے سنگ مرمر کے چبوترے سے گر کر ارملا کی جان گئی تھی ۔ !

ٹہلتے ٹہلتے یکایک انہوں نے مجھ سے پوچھا ۔

" جب ارملا گری اس وقت تم کہاں کھڑی تھیں ۔؟"

میں چونک گئی ـــــ آج تک انہوں نے مجھ سے یہ سوال نہ پوچھا تھا ۔ بلکہ آج تک اس واقعہ پر کبھی کوئی گفتگو میرے اور ان کے درمیان نہ ہوئی تھی ـــــ میں دیر تک ان کی طرف دیکھتی رہی ۔ پھر بڑی مضبوطی سے اپنی جگہ سے چل کر سنگ مرمر کے اس چبوترے کے پاس کھڑی ہو گئی ۔ جہاں میں اس رات کھڑی تھی جس رات ارملا کی شادی کنور جی سے ہونے والی تھی ۔

" یہاں ـــــ !" میں نے کھڑی ہو کر بتایا ۔

" اور ارملا کہاں تھی ۔ ؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا ۔

" میں نے چبوترے پر ہاتھ رکھ کر کہا ـــــ

" یہاں ۔ !"

" یہاں کہاں ۔ ؟" ٹھیک جگہ پر کھڑی ہو کر بتاؤ ۔!"

میں چبوترے پر بے خوف اور بے دھڑک چڑھ گئی ۔

اور اس جگہ پر کھڑی ہو گئی جہاں ارملا کھڑی تھی ۔ !

" وہ انگور کے خوشے کہاں تھے ۔ ؟"

"یہاں — !" میں نے اپنے سر کے اوپر ہاتھ ہلاتے ہوئے بتایا۔ !

"توڑ کے بتاؤ — !"

میں نے انگوروں کا ایک خوشہ توڑ کر ہاتھ میں جھلایا۔ وہ کچھ مایوس سے ہو گئے — جیسے انہوں نے کوئی چال سوچی تھی۔ جو کارگر نہ ہو رہی تھی — چند لمحوں تک وہ چپ رہے پھر یکایک بولے۔

"تم یہیں کھڑی رہو — میں ابھی آتا ہوں۔" مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ مگر میں کھڑی رہی وہیں چبوترے پر انگور کا خوشہ ہاتھ میں جھلاتے ہوئے !

تھوڑی دیر کے بعد وہ اندر سے باہر آگئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک رائیفل تھی۔ میں بھونچکی رہ گئی۔ یکایک لہو زور سے میری رگوں میں اچھلا۔ پھر تھم گیا۔ پھر دل کا مد و جزر ڈوبنے سا لگا۔ !

اس نے میری طرف نشانہ لے کر کہا۔ "اسی طرح کھڑی رہو۔ ہاتھ میں انگور کا خوشہ لے کر۔ مطلق نہ ہلنا۔ میں تنبیہ کرتا ہوں۔ ذرا بھی نہ ہلنا۔ !"

"یہ کیا مذاق ہے۔" میں چلائی۔

"گھبراؤ مت۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ پہلے

ہی وار ہیں انگور کا خوشہ تمہارے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے کھڈ میں گر جائے گا۔ !"

کنور نے شست باندھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اب سب کچھ جانتا ہے۔ مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔ اور دور نزدیک کوئی خادم بھی موجود نہ تھا۔ اور کنور کے پاس رائفل تھی —— بھاگنے سے بھی کیا فائدہ —— وہ مجھے زندہ نہ چھوڑیگا۔ رائفل کی نال اب میرے سامنے تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ !

یکایک زور کا فائر ہوا۔ انگور کا خوشہ میرے ہاتھ سے گر کر دور نیچے کہیں کھڈ میں بکھر گیا ہوگا۔ میں چبوترے پر صحیح وسلامت کھڑی تھی۔

"دیکھا میرا نشانہ۔" کنور نے رائفل چھوڑ کر تالی بجائی۔ اور مسکرا کر مجھے دونوں ہاتھوں سے چبوترے سے اتار لیا۔

دوسرے سال بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ تیسرے سال کی برسی پر بھی یہی ہوا۔ اور اگلے پانچ سال تک یہی ہوتا رہا۔ وہ مجھے چبوترے پر چڑھا دیتے۔ انگور کا ایک خوشہ میرے ہاتھ میں دیتے خود اندر رائفل لینے جاتے۔ واپس آکر نشانہ باندھتے انگور کا خوشہ میرے ہاتھ سے گر جاتا۔ میں صحیح وسلامت کھڑی رہ جاتی۔ یہ سب کچھ تو ہوتا تھا۔ مگر ان لمحوں میں جس جہنم سے گزرتی

تھی۔ اس کا اندازہ کچھ مجھے ہی تھا ـــــ اس وقت شست
باندھتے وقت کنور کی آنکھیں گویا کسی اندرونی شیطنیت سے
ابلنے لگتی تھی۔ میں ان آنکھوں کی چمک اور غصے اور انتقام کی
تاب نہ لا سکتی تھی۔ مگر مجھے اس کھیل میں بھی ہارنا نہیں تھا۔
کیا وہ مجھے اس بات کی دعوت دے رہا تھا کہ جب وہ رائفل لینے
اندر جاتا ہے۔ اور جب وہ رائفل لے کر واپس آتا ہے۔ تو
کیا اس بیچ کے عرصہ میں وہ مجھے چبوترے سے نیچے اترا ہوا پائیگا۔
یا کیا وہ یہ چاہتا تھا کہ اس عرصہ میں میں خود اپنے احساس جرم
سے متاثر ہو کر نیچے کھڈ میں چھلانگ لگا دوں گی۔ یا جب وہ مجھے
سارا کھیل ختم ہو جانے کے بعد چبوترے سے اتارتے ہوئے
اپنی باہوں میں اسے کانپتے ہوئے ڈرتے ہوئے سسکتے ہوئے ملونگی۔
ایسا تو کبھی ہو نہیں سکتا۔ ہر بار میں نے اسے مایوس کیا۔ ہر سال
مایوس کیا۔ مگر اسمیں شبہ نہیں کہ ہر سال وہ دن میرے لئے
قیامت کا دن ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے ہر سال وہ اس
روز اس قتل کا مجھ سے بدلہ لیتا تھا۔ ایسی طنزیہ مسکراہٹ
ہوتی تھی اس وقت اس کے چہرے پر۔ کہ میرا جی چاہتا تھا اس
کا منہ نوچ لوں۔ مگر میں کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ کیونکہ ہر کھیل کے
اپنے آداب ہوتے ہیں۔ اور ہم لوگ جو حکومت کرتے ہیں۔ کھیل
کے آداب نہیں توڑ سکتے۔!

پانچویں سال میں نے کنور جی سے کہا۔

"آج آپ وہاں کھڑے رہیئے۔ جہاں ارملا کھڑی تھی۔ جہاں پانچ سالوں سے میں کھڑی ہو رہی ہوں۔ اسی جگہ اسی طرح۔ ہاتھ میں انگور کا خوشہ لے کر۔ !"

"وہ کیوں۔ ؟"

"میرا بھی نشانہ دیکھیئے ـــ بے خطا ہے۔ !"

چند لمحوں تک وہ مجھے بڑے غور سے دیکھتے رہے۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر اتر آئی۔ پھر وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر چبوترے کی طرف بڑھ گئے۔ ! ایک لمحہ کے لئے انکا ہاتھ اس جگہ پر رکا جہاں ارملا کے قدم رکے تھے۔ پھر وہ ہاتھ ان کے ماتھے تک گیا۔ جیسے برسوں سے بچھڑی ہوئی ارملا کے قدموں کی مٹی انہوں نے اپنے ماتھے سے لگالی۔ پھر وہ ارملا کی جگہ کھڑے ہوگئے۔ ہاتھ بڑھا کر انہوں نے انگور کی بیل سے اودے انگوروں کا ایک بڑا خوشہ توڑ لیا۔ اور اسے جھلاتے ہوئے بولے۔

لایئے۔ آپ کا نشانہ بھی دیکھیں۔ ؟

میں اندر گئی۔ اپنی رائیفل لے کر آئی۔ شست باندھی۔ وہ انگور کا گچھا ہاتھ میں لٹکائے، ارملا کی جگہ کھڑے تھے۔ میں نے شست باندھ کر گولی چلا دی۔

گولی ان کے سینے کے پار ہوگئی۔ چشم زدن میں ان کا

جسم دور نیچے ہزاروں فٹ گہری کھڈ میں لڑکھڑاتا ہوا گرتا چلا گیا۔
اور بان گنگا کی شوریدہ لہروں میں گم ہو گیا۔

رانی جی چپ چاپ تکیوں کے سہارے بستر پر بیٹھی ہوئی اپنی رنگین دلائی کے کنارے سے کھیل رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ اخباروں میں مَیں نے اس کا ذکر پڑھا تھا۔ غالباً برطانوی حکومت نے آپ پر مقدمہ بھی چلایا تھا۔

"ہاں — مگر میں بری ہوگئی تھی۔ میں نے دو کروڑ روپے کی رشوت دی تھی۔"

"کوئی کرنل تھے جو آپ کے مقدمے کی تفتیش پر مقرر کئے گئے تھے۔؟"

"ہاں کرنل وائیڈان کا نام تھا۔ رانی جی نے اقرار کیا۔ انہوں نے رد کردیا روپیہ لے کر مجھے بری الذّمہ قرار دیا۔"

وہ اپنی ریشمی دلائی کے رنگین کناروں سے اپنی انگلی کے ناخن الجھا کر اس کے تار نکالنے لگیں۔ میں نیا سگار سلگا کر دھوئیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑنے لگا۔

اس خاموشی کے دوران میں خادمہ آئی۔ اور فانوس روشن کر گئی۔ پہاڑوں پر سورج بہت جلد ڈوبتا ہے۔ شام بہت جلد گہری ہوتی ہے۔ سناٹا بہت جلد بڑھتا ہے۔ اس وقت ہر چار طرف سناٹا اس قدر بڑھ گیا تھا کہ مجھے اپنا دم رکتا ہوا محسوس ہوا۔

× × × × ×

میں نے پوچھا —— "آخر کار آپ نے اس راز کو افشا کر دینے کا فیصلہ کیوں کیا۔؟"

وہ بولی۔ "اپنی خوشی سے نہیں بتا رہی ہوں۔ مجبور ہو کر بتا رہی ہوں۔ کچھ عرصے سے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اگر کسی کو نہیں بتاؤں گی تو شاید میرا دم رک جائیگا —— میرا سینہ پھٹ جائیگا۔ شاید میں پاگل ہو جاؤنگی۔ ذہنی توازن کھو بیٹھوں گی۔ بیٹھے بیٹھے مجھے چکر آنے لگتے تھے۔ ساری دنیا مجھے گھومتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اور پھر چاروں طرف اک

گونج میرے چاروں طرف چکر لگاتی ہوئی ایک بھیانک چمگادڑ کی طرح چیختی چلاتی ہوئی رات کو میرے اس قدر قریب آجاتی ہے۔ کہ میں اپنے بستر سے اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہوں۔

میرا سارا جسم پسینے میں تر ہو جاتا ہے۔ یہ اذیت مجھ سے برداشت نہیں ہوتی مجھے ایسا لگتا جیسے اب مجھے کسی نہ کسی کو بتانا ہی پڑیگا۔

اور اگر نہیں بتاؤں گی۔ تو شاید آپ ہی آپ میں بک دونگی۔ دیواروں سے کہہ دوں گی۔ خادموں سے ہی کہہ دوں گی۔ نتگ کے پیڑ سے ہی کہہ دوں گی۔ شاید چیختی چلاتی ہوئی عدالت میں جاکر سب کے سامنے کہہ دوں گی۔ اب تو کہنا ہی پڑیگا۔ !"

"شاید تم نے ٹھیک ہی کیا۔ قتل کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ قاتل اور مقتول کے علاوہ۔ اور وہ ایک سائے کی طرح پیچھا کرتی ہے۔ اور اس وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک سب اس کی ہستی کا اعتراف نہ کر لیا جائے۔ مگر آپ نے اس کام کے لئے مجھی کو کیوں چنا۔ ؟"

"کیونکہ دوسرے لوگ قتل سے ملوث ہو چکے ہیں۔ وہ جو مجھ پر شبہ کرتے ہیں۔ اور کچھ کہتے نہیں۔ وہ جنہوں نے

سنا ہے اور خاموش ہیں۔ وہ جنہوں نے خوشامد کی ہے اور رشوت لی ہے۔ وہ جنہوں نے آنکھیں چرائی ہیں۔ اور جنہوں نے بھول جانا مناسب سمجھا۔ وہ سب کسی نہ کسی طرح اس قتل میں میرے ساجھے دار ہیں۔ ان کو بتانے سے کیا حاصل وہ تو اس قتل کا بوجھ کسی نہ کسی صورت سے اپنے کندھے پر لئے پھرتے ہیں۔ ان کو بتا کر میں کیا کروں گی۔ اس کام کے لئے مجھے ایک مکمل اجنبی کی ضرورت تھی۔ اس لئے میں نے تمہارا انتخاب کیا۔ !"

"شکریہ — !" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تو اب میں جاؤں۔ ؟"

"نہیں۔ بیٹھو۔ !" وہ تحکمانہ لہجہ میں شدید سختی سے بولی۔

"میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ !"

اس کی سانس پھول رہی تھی۔ چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا۔ ایک رنگ جا رہا تھا۔ اس نے رک رک کر مجھ سے پوچھا۔

"کیا وقت ہے۔ ؟"

"چھ بجنے میں دس منٹ ہیں — مگر آپ اپنی خواب گاہ میں گھڑی کیوں نہیں رکھتیں۔ ؟"

تھی ۔۔۔! مگر میں نے اسے ڈرائینگ روم میں منتقل کرا دیا ہے۔ ابھی چھ بجنے پر تم اس کلاک کا گانگ ڈرائینگ روم میں سنو گے۔!"

"کیا اس کلاک کا بھی اس داستان سے کوئی تعلق ہے۔؟"

"ایک طرح سے ہے۔ اور تمہیں انتخاب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج میں اپنے قریب ایک ایسا آدمی چاہتی تھی۔ جو جدید تہذیب کا ہو۔ اور سائنس سے واقفیت رکھتا ہو۔ میں بھی وہمی عورت نہیں ہوں۔ میں پراسرار اور مافوق الفطرت چیزوں میں اعتقاد نہیں رکھتی ہوں۔ مگر ادھر کچھ دنوں سے جو اس گڑھی میں ہو رہا ہے۔ وہ اس قدر عجیب حیرت انگیز اور پراسرار ہے کہ اس کی کوئی توجیہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اسی لیے میں نے تمہیں بلایا ہے کہ تم ایک ڈاکٹر ہو۔ ممکن ہے تم اس کی کوئی ایسی تشریح کر سکو۔ جو اوہام سے پرے ہو۔ اور انسانی ذہن کے قریب ہو ۔۔۔ گو میں سمجھتی ہوں۔ کہ اب ایسا کرنا بھی ناممکن ہے۔ پھر بھی میں تم پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔ ممکن ہے تم میرے بچاؤ کی کوئی صورت نکال سکو۔!"

"بات کیا ہے۔؟"

ادھر چند دنوں سے عجیب و غریب واقعات ہو رہے ہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں۔ کہ ڈرائینگ روم میں جہاں میری نظر کے سامنے کنور راج بہادر سنگھ کی تصویر لگی ہے۔ وہاں ایک ہفتہ پہلے تک ارملا کی تصویر لگی تھی۔ جسے میں ہر روز ہار پہنایا کرتی تھی۔ برسوں سے یہ میرا معمول تھا۔ اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پھر جب کنور جی مر گئے تو میں نے ان کی بھی ایک تصویر مخالف دیوار پر لگا دی اور ہر روز اسے بھی ہار پہنانے لگی۔!"

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے میری مسکراہٹ دیکھ لی۔ مگر کچھ کہا نہیں۔ اپنی داستان جاری رکھی۔

"ارملا کی تصویر کے نیچے ـــــ بہت نیچے ایک کارنس ہے۔ اس کارنس پر دو چھوٹی کیبنٹ سائز کی تصویریں برسوں سے ساتھ ساتھ کارنس پر اکٹھی تھیں اور ان کے اوپر ارملا کی بڑی تصویر تھی۔ چاندی کے فریم میں جڑی ہوئی جسے میں ہر روز ہار پہنایا کرتی تھی۔!"

آج سے سات روز پہلے ایک عجیب واقعہ ہوا جب میں حسب معمول ارملا کی تصویر کو ہار پہنانے گئی۔ تو میں نے دیکھا کہ میرا نا ہار ارملا کی تصویر سے ٹوٹ کر نیچے کنور جی کی تصویر کے گرد حمائل ہو چکا ہے۔ اس کو بہت سی باندیوں نے

بھی دیکھا۔ اور تعجب میں کھڑی رہ گئیں۔۔!"

میں نے کہا ـــــ "یہ محض ایک اتفاق ہو سکتا ہے۔ ہار کا تاگا کمزور رہا ہوگا ہوا کے کسی جھونکے سے یا فریم کے دباؤ سے ٹوٹ کر نیچے گر پڑا۔ نیچے کنور جی کی تصویر تھی۔ اس کے گرد حمائل ہو گیا۔ سب بات سمجھ میں آتی ہے۔ !"

"پہلے دن کی بات کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کوئی بھی اسے اتفاق پر محمول کرے گا۔ میں نے بھی یہی کیا۔ اور حسب معمول کسی تردد یا پریشانی یا اہراس کا اظہار کئے بغیر اس پرانے ہار کو اٹھوا کر پھنکوا دیا۔ اور نیا ہار ارملا کی تصویر کے گرد چڑھا دیا۔

مگر دوسرے دن جب میں ارملا کی تصویر کو ہار پہنانے گئی۔ تو وہ ہار بھی ٹوٹ کر کنور راج کی تصویر کے گرد حمائل ہو چکا تھا۔ !"

رانی جی نے اتنا کہہ کر میری طرف غور سے دیکھا۔ جیسے انہوں نے مجھے چت کر دیا ہو۔ میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "دوسرے دن کا واقعہ بھی ایک اتفاق ہو سکتا ہے۔ یا ـــــ کسی کی شرارت ـــــ !"

"میں نے بھی ایسا سوچا تھا ـــــ" رانی جی نے کہا۔ "اور اسی لئے میں نے اسی دن ارملا کی تصویر کو وہاں سے اتروا کر

مخالف دیوار پر لگوادی ۔ جہاں کنور جی کی تصویر تھی ۔ اور کنور جی کی تصویر کو وہاں لگا دیا ۔ جہاں ارملا کی تصویر تھی ۔ یعنی جہاں پر اب وہ مجھے دکھائی دیتی ہے ۔ !"

"پھر کیا ہوا ۔ ؟" کیا تیسرے دن بھی ہار ٹوٹ کر گرا ۔ ؟"

"نہیں ۔" وہ بولی ۔ "مگر اس دن ایک اور عجب واقعہ ہوا ۔ شام کے چھ بجے میں اسی بستر پہ اکیلی بیٹھی تھی ۔ پہلے میں نے اپنے خواب گاہ کے کلاک کے گانگ کی آواز سنی ۔ وہ اس دن تمہارے جانب کی دیوار پہ لٹکا ہوا تھا ۔ جب میں نے وقت دیکھنے کے لئے اس پہ نگاہ ڈالی ۔ تو مجھے وہ کلاک عجیب سا دکھائی دیا ۔ اس کا ڈائیل ایسا لگا جیسے کسی خوفناک چیز کا چہرہ ہے ۔ اور اس کی سوئیاں جیسے دو بڑے بڑے بازو ہوں ۔ اور گھنٹوں کے حروف جیسے بہت سی بڑی بڑی آنکھیں ہوں ۔ جو بٹ بٹ میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھ رہی ہوں ۔ !"

میں نے گھبرا کر کلاک سے نظریں ہٹا لیں ۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوا ۔ جیسے فضا کا سناٹا بہت بڑھ گیا ہے ۔ خواب گاہ اور ادھر کھلے ڈرائینگ روم کی روشنیاں اکدم مدھم پڑ گئیں ہیں ۔ اور میں دور سب کی نظروں سے دور اس کمرے میں اکیلی قید کر دی گئی ہوں ۔ میرا دم گھٹنے لگا ۔ میں نے یہ کمرہ چھوڑ کر ڈرائینگ

روم سے جانے کا قصد کیا۔ تو میں یکایک چیخ مار کے رہ گئی۔ میں نے کیا دیکھا کہ اس دیوار پر جہاں کنور راج بہادر سنگھ کی تصویر لگی ہے۔ اس دیوار پر ایک اور تصویر سرکتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ روشنیوں اور سایوں کی جھلملاتی شطرنجی میں ایک تصویر بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ بڑھتے بڑھتے وہ تصویر کنور راج جی کی تصویر کے ساتھ لگ گئی ـــــ میں دھک سے رہ گئی۔ یہ ارملا کی تصویر تھی۔ میرا دماغ چکر کھانے لگا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر دیکھا۔ واقعی ارملا کی تصویر تھی۔ جو مخالف دیوار سے ہٹ کر کسی پراسرار طریقے سے چلتی ہوئی اپنی پرانی جگہ پر آن پہنچی تھی۔ خوف اور دہشت سے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر جب آنکھیں کھولیں تو ـــــ وہ تصویر وہیں موجود تھی۔ اور اب میری طرف دیکھ کر ایک طنزیہ مسکراہٹ سے مسکرا رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا۔ کہ ارملا تصویر کے فریم کے اندر اپنی جگہ سے سرکنے لگی۔ سرکتے سرکتے کنور راج کی تصویر کے فریم کے پاس پہنچ گئی۔ پھر جیسے فریم پگھل گیا۔ غائب ہو گیا۔ کہیں گم ہو گیا۔ پھر جیسے دونوں تصویریں ایک ہو گئیں۔ اب ارملا میرے شوہر کے قریب کھڑی مسکرا رہی تھی۔ جو ہاتھ میں رائفل لئے کھڑے تھے۔ وہ بار بار ایک انگلی اٹھا کر میری طرف اشارہ

کرتی تھی۔ اور انہیں اپنی رائفل اٹھانے کا مشورہ دیتی تھی۔ بار بار مشورہ دیتی تھی۔ اور وہ مسکرا کر ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر انکار کرتے تھے —— انکار کرتے تھے اور اس سے پیار کرتے تھے —— میں نے غصّے میں آکر آنکھیں بند کرلیں۔ لحاف اپنے اوپر اوڑھ لیا۔ چند منٹ کے بعد جو سر لحاف سے نکالا۔ تو ارملا اسی طرح کنور راج کی باہوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ اور وہ دونوں میری طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ !

"ایسا ہو نہیں سکتا۔" میں نے سختی سے سر ہلا کر کہا۔ یہ سب آپ کے دماغی خلجان کا نتیجہ ہے —— آپ اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہیں۔ !"

"جو میں کہتی ہوں۔ وہ بالکل سچ ہے۔ اسی لئے میں نے تمہیں بلایا ہے۔ آج تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے۔ یہ کوئی ایک دن کا واقعہ نہیں ہے۔ پچھلے پانچ روز سے یہی ہو رہا ہے۔ اسی طرح چھ بجتے ہیں اسی طرح تصویر چلتی ہے۔ کنور جی کی تصویر سے لگ جاتی ہے۔ بیچ کا فریم ٹوٹ جاتا ہے۔ دونوں تصویریں ایک ہو جاتی ہیں۔ ارملا میرے شوہر کو اشارے سے مجھ پر رائفل چلانے کے لئے کہتی ہے۔ وہ مسکرا کر انکار کرتے ہیں۔ دونوں مصروف اختلاط ہو جاتے ہیں۔ اور وہ کم بخت مردار ارملا میری آنکھوں کے سامنے مجھے جی جان سے جلاتی ہے۔ گزشتہ پانچ روز

سے یہی ہو رہا ہے۔ اور آج ایسا لگتا ہے۔ جیسے کوئی بہت بڑی بات ہونے والی ہے۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔ کیونکہ آج ارملا کی برسی ہے۔ آج رہ رہ کر میرا دل ڈوب رہا ہے!

یکایک ڈرائنگ روم سے ایک خوفناک آواز آئی۔

"ڈانگ۔!"

یہ ڈرائینگ روم کا کلاک تھا۔ چھ بجا رہا تھا۔

اس کی بھاری گونج دار دہشت ناک آواز خوابگاہ کے اندر چاروں طرف گونج رہی تھی۔!

ڈانگ! ڈانگ!! ڈانگ۔!!!

واقعی ایسا لگا جیسے ہمارے چاروں طرف سناٹا گہرا ہو گیا۔ جیسے ہمارے چاروں طرف خاموشی کا سمندر پھیل گیا تھا۔ اور ہم اکیلے ایک سنسان جزیرے میں اکیلے کھڑے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے بھی واقعی ایسا لگا۔ جیسے ڈرائینگ روم اور خوابگاہ کی بتیاں بہت مدھم پڑ گئی ہیں۔ روشنی گھٹ گئی ہے۔ تاریکی بڑھ گئی ہے۔ اس گہرے سناٹے میں میں نے رانی جی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اکدم پیلا پڑ گیا تھا۔ بڑی بڑی گہری سبز پتلیوں میں خوفناک وحشت نمایاں تھی۔ اس کا سارا جسم گویا کسی تیز بخار کی حدت میں کانپ رہا تھا۔

ڈانگ!! ڈانگ!!!

کلاک چھ بجا کر چپ ہو گیا۔ پھر ایسی خاموشی آئی۔ جیسے قیامت سے پہلے آتی ہے۔ اس سناٹے میں میری باہوں کے بال کھڑے ہو گئے اور میرے سارے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اور میں نے دیکھا کہ رانی کی آنکھیں گویا اپنے حلقے سے باہر ابلی پڑ رہی ہیں۔ کسی خوفناک تاثر نے ان کے چہرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور ایک ہاتھ اپنے گلے پر رکھے ہوئے حلق سے کہہ رہی ہیں۔

"وہ دیکھو۔ وہ دیکھو۔ تصویر آ رہی ہے۔!"

میں نے ایک لمحہ کے لئے دور خواب گاہ کے دروازہ سے پرے ڈرائینگ روم کی جھلملاتی روشنیوں اور سایوں میں دیکھنے کی کوشش کی پھر میں مبہوت ہو کر رانی جی کا چہرہ دیکھنے لگا۔ جس کے خد و خال میری آنکھوں کے سامنے بگڑ رہے تھے۔! اس کی گہری سبز پتلیوں میں کوئی خوفناک غیر بری ناچ رہا تھا۔!

اس کا دم رک رہا تھا۔ اور وہ بڑی مشکل سے کہہ رہی تھی۔

"دونوں تصویریں ایک ہو گئیں۔ اربلا کنور راج کے پاس پہنچ گئی۔!"

رانی جی کے ہونٹوں سے کف نکل رہا تھا۔

"وہ ان سے رائفل اٹھانے کو کہہ رہی ہے ......!"

"ہے رام .... اس نے رائفل اٹھالی ......!"

میں یکلخت اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا - اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ڈرائینگ روم کی طرف جانے لگا - یکایک پیچھے سے ایک زور کی چیخ سنائی دی - یہ رانی جی کی آواز تھی - یہ چیخ سنکر میں ڈرائینگ روم کی طرف جاتے جاتے پلٹ آیا — اور بھاگ کر رانی جی کے بستر کے قریب پہنچا -

رانی جی کا جسم تکیوں سے نیچے اوندھا گرا پڑا تھا - میں نے جلدی سے جسم کو اٹھا کر جو سیدھا کیا - تو سیدھے میری نگاہ اس کی آنکھوں میں گئی - وہ گہری سبز پتلیاں بے جان اور ساکت تھیں -

میں نے جلدی سے نبض ٹٹولی - نبض غائب تھی - دل کی طرف نگاہ کی - رانی جی اپنے دونوں ہاتھوں سے دل کو یوں پکڑے تھیں - جیسے گولی سیدھے ان کے دل میں لگی ہو - میں نے دونوں ہاتھ ہٹا کے دیکھا دل کی حرکت بند تھی -

رانی جی کو وہیں بستر پہ مردہ چھوڑ کر میں ڈرائینگ روم کی طرف بھاگا —— بھاگتا بھاگتا سیدھا ڈرائینگ روم کے وسط میں چلا گیا — اور گھوم کر چاروں طرف دیکھنے لگا -

ڈرائینگ روم میں کوئی نہ تھا - کنور جی اور ارملا

کی تصویریں الگ الگ دو مخالف دیواروں پر آمنے سامنے ایستادہ تھیں۔ اور اپنی جگہ سے مطلق نہیں ہلی تھیں۔ !

خوشنویس۔ اعجاز نبی ۳۳۴۹، احاطہ کیدارنہ باڑہ ہندو راؤ دہلی۔

ایک حادثہ نے اس کی زندگی میں زہر گھول دیا۔
اُس نے دنیا کو ٹھکرانا چاہا۔ لیکن دنیا نے اُسے
زندہ رہنے پر مجبور کر دیا۔

ایک ضدی اور خودسر لڑکی کی کہانی

درگا شنکر بھاردواج کے رومانی ناول

ضدی لڑکی

اپنی پہلی فرصت میں پڑھئے

قیمت
ساڑھے پانچ روپے

اہلووالیہ بکڈپو ۲۸۳ نبو روہتک روڈ نئی دہلی